بدلیاں

مسز سحاب قزلباش

ہندستانی پبلشرز دلّی

طبع اول دیال پرنٹنگ پریس دہلی مئی سنہ ۱۹۴۲ء

قیمت
عہ

سول ایجنٹس

نگارستان ایجنسی اردو بازار دہلی

نوٹ۔ یہ کتاب سرے سے غلط ہے
پڑھ کر بلا وجہ وقت ضائع نہ کیجیے؟

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ سرکوش بھیا نے پورے ایک سال میں بدلیوں پر توجہ دی۔ اور یہ آسمانِ ادب پر چھائیں گی نہیں۔ بلکہ ان کے اودے نیلے سرمئی رنگوں کو دیکھ کر ادب کی مشہور و معروف بجلیاں قہقہے لگائیں گی۔ وہ دن دور نہیں جب وہ کوند کر بدلیوں کے باریک پچھوں سے جھانک جھانک کر تنقیدی اولے برسائیں گی یعنی دسرمنڈاتے ہی اولے پڑینگے، اور پھر آسمانِ ادب سنہری روشنی سے جگمگاتا رہیگا۔ کسی کو محسوس بھی نہ ہوگا کہ ادبی نرم نرم روئی کے گالوں نے اتنے لمبے چوڑے آسمان پر چھا جانے کی کوشش کی تھی۔ مگر ان میں سے ٹھنڈی ٹھنڈی بوندیں نہیں گریں۔ سوتے ہوئے بے خبروں پر یہ چھینٹیں نہیں دے سکیں تاکہ وہ چونک پڑتے اور اٹھنے کی کوشش کرتے۔ زمین ویسی ہی پیاسی ہے۔ پھر گل بوٹے کیسے نشو و نما پائیں گے ——— اور ادب میں دلچسپی لینے والے کہیں گے۔ اجی کیا یہ ایک سال سے ہندستانی پبلشرز

کاڈنکا پیٹ رہے تھے۔ محض بکواس کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔ بیکار، کوئی کام کی بات نہیں۔ کہیں سیاہ چمکیلی آنکھیں ہیں۔ جو کبھی ہنستی ہیں تو کہیں روتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کہیں گلابی خشک ہونٹ، کہیں زرد لمبی سی کانپتی ہوئی انگلیاں، کہیں گورے گورے گداز ہاتھ۔ فلمی گانوں سے بھرپور ـــــ کبھی چاندنی راتوں میں رویا جا رہا ہے تو ساون کی گھٹاؤں میں موسیقی میں سما گئے۔ انگوٹھیوں کی ادلا بدلی۔ زرد، سرخ چہروں کے اتار چڑھاؤ۔ دق کے ڈھانچوں میں رومان بند پڑے نظر آتے ہیں۔ جن سے بو آ رہی ہے کہیں چوکلیٹ کھایا جا رہا ہے کھلونوں سے دل بہلایا جا رہا ہے۔ کہیں دیکھتے دیکھتے اسکول میں پہنچ گئے۔ بھئی یہ بھی عجیب مذاق سمجھ لیا لوگوں نے۔ افسانے لکھنے اتنے آسان ہو گئے۔ کسی کی آنکھ دکھی۔ افسانہ لکھ مارا۔ ذرا نزلہ ہوا۔ تکلیف ہوئی چلو افسانہ لکھ رہے ہیں۔ یہ کیا۔ روزمرہ کی زندگی کی تصویر ہے بھائی۔ کوا چلا ہنس کی چال محترمہ اپنی چال بھی بھول گئیں سحاب صاحب۔ لاحول ولا، کیا زمانہ آ گیا ہے۔ لو بھئی دو روپئے پھینک آئے۔ یہ چھاپنے والے بھی کمانے کی نئی نئی ترکیبیں سوچتے ہیں۔ حقیقت ہے۔ یہ تو عام پڑھے لکھے لوگوں کی رائے ہو گی۔ ہمارے اس کرتوت کے متعلق نگران بڑی بڑی ہستیوں کی رائے بس کانپ جاتی ہوں یہ سوچ کر۔ بدلیاں پڑھنے کے بعد۔ تھوڑی بہت جو ملاقات ہے وہ بھی ہاتھ سے گئی۔ لوگوں پر خواہ مخواہ کا جو رعب تھا وہ تو گدھے کے سر سے سینگ والا حساب ہو جائے گا۔ کیا کروں ناحق سرخوش بھیا کو اجازت دی۔ بابا جان کی روح کو الگ اذیت ہو گی۔ جب لوگ میرا مذاق اڑائیں گے یہ ہے آغا شاعر تزلباش مرحوم کی لڑکی کی لکھی ہوئی بکواس۔ نام ڈبویا اتنے بڑے لائق باپ کی لڑکی، اور یہ بکواس فرمائی۔ مگر سرخوش بھیا نے وہ سبز سبز باغ دکھائے کہ عام لڑکیاں تمہارے ہی

جیسے افسانے لکھتی ہیں، تم بھی چھپوا لو مجموعہ۔ اور اپنی پہلی کتاب کی خوشی میں اجازت دیدی۔ ویسی ہی بےچینی مجھے بھی ہو رہی تھی جیسے شوکت تھانوی صاحب کو اپنی پہلی کتاب میں محسوس ہوئی تھی۔ ان غریب کو کاتب کے بچوں کو بہلانا پڑا تھا کہ وہ باپ کو کام کرنے دیں۔ اور کبھی کبھی کاتب صاحب کے گھر کا سودا سلف بھی لائے مگر ہم بچے رہے ان احسانوں سے جب ذرا انتظار کی شدت محسوس ہوتی تو ریڈیو کھول کر نئی کتابوں پر ریویو سننے لگتی۔ اور ڈر لگنے لگتا کہ وقار صاحب ہمیں بھی خوب جی کھول کر صاف صاف سنائیں گے۔ اور پھر دعا مانگ لی کہ اے خدا کچھ ایسا ہو کہ مسودے کھو جائیں اور یہ کتاب نہ چھپ سکے۔ سب سے زیادہ بڑے بھائی جان نے ڈرا رکھا ہے۔ ان کے دن رات کے مذاق نے سانس روک لیا ہے۔ اور مجھے اپنی کتاب کے اس مشغلے کا خیال آگیا اسی وجہ سے میں نے کسی اور رسالے میں اپنے افسانے نہیں بھیجے۔ صرف چمنستان میں چھپے وہ بھی نہ جانے سر خوش بھیا کو اور افسانے نہیں ملتے تھے جو وہ ہر مہینے میرے رجسٹر میں سے تازہ لکھے ہوئے افسانے پھاڑ کر چپکے سے لے جاتے۔ اور جب میں سوچتی کہ فلاں جگہ یوں نہیں یوں لکھوں یا اس جگہ ہیروئن کو ہنسنے کے بجائے روٹھ جانا چاہیئے۔ اور میں اس ارادے سے رجسٹر کھول کر ٹھیک کرنے کی نیت سے دیکھتی تو وہاں پھٹے ہوئے ٹھنٹھے اونچے نیچے کناروں کی صورت میں نظر آتے۔ پھر معلوم ہوتا کہ وہ تو اس مہینے کے چمنستان میں چھپنے گئے ہیں۔ بجھ کر رہ جاتی۔ ایک پرانے افسانے "نین ہین کو راہ دکھاؤ" کی کاپیاں پڑھ رہی تھی۔ جو بہت پرانا لکھا ہوا تھا۔

اب یاد بھی نہیں تھا۔ ہاں شاید جب لکھا تھا جب بھگت سورداس فلم آئی تھی۔ مجھے اس کا گانا بہت پسند آیا اور اس کو آخر میں نے اپنے افسانے کا عنوان بنا لیا [illegible]

محسوس ہوا جیسے اس کے خیال کسی اور افسانے کے خیال سے ٹکرا گئے ہیں بہت سوچا تو یاد آیا کہ شاید اسی مہینے کے ہمایوں کے پرچے میں ناہید عالم کا افسانہ پھول کانٹے پڑھا۔ اب کیا کروں۔ بالکل وہی چیز ہے تھوڑا سا فرق۔ حیران تھی کہ ایک ہی خیال دو آدمیوں کے دماغ میں کیسے آیا ایک ہی تشبیہہ۔ پھر کچھ دن ہوئے میں نے چمنستان کا سالنامہ شائع ہونے سے پہلے، بے بی عنوان سے ایک افسانہ لکھا۔ مگر دم ہی تو نکل گیا کہ اتنی محنت بیکار ہوئی۔ یعنی شفیق الرحمن صاحب نے نجانے کہاں سے لکھ ڈالا۔ میرا بے بی افسانہ تو اس قدر ملتا ہے کہ نہ تو عنوان بدلتے بن پڑتی ہے نہ ماحول اور کردار تبدیل کر سکتی ہوں۔ چونکہ بدلیاں دیر میں شائع ہو رہی ہیں — مصیبت میری وہ پورا افسانہ۔ اب رجسٹر میں پڑا سو رہا ہے۔ کس وجہ سے کہ پڑھنے والے یہ تمیز نہ کر سکیں کہ یا تو بی سحاب نے شفیق الرحمان کا افسانہ پورا کا پورا چرا لیا ہے یا پھر انہوں نے کوشش کی مگر شفیق صاحب پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں ان کو چور نہیں ٹھہرایا جاتا اور ہم رگڑے میں آ جاتے۔ لہٰذا خیریت اسی میں سمجھی کہ اُسے رجسٹر میں ہی دفن کر دیں۔ خیر میں کہاں سے کہاں آ گئی۔ مطلب یہ تھا کہ میں نے افسانے اس لئے نہیں لکھنے شروع کئے کہ کتابیں چھپیں نام مشہور ہو۔ یا رسالے میں نام چھپے۔ اور اس کی خواہش ہو کہ اڈیٹر صاحبان افسانے کے اوپر اپنے خوشامدی جذبے سے قلم کو حرکت دیں کہ فلاں مشہور و معروف محترمہ کا افسانہ، فن کے لحاظ سے چوٹی کا افسانہ ہے یا اور اسی قسم کے الفاظ لکھے جائیں۔ مگر جناب 'من خوب می شناسم' اور ضمیر پہیلی کی صورت میں بول اٹھتا ہے کہ "ابھی تو ات تا پانی ہے"۔ اور شرمندہ ہو کر اپنے ٹخنوں تک کہ پانی میں ادیبوں کے ٹوٹے ہوئے قلم اٹھا اٹھا کر غور سے دیکھنے لگتی ہوں۔

کیونکہ بھائی جان نے کہا تھا۔ اور ڈاکٹر رشید جہاں نے بھی باتوں باتوں میں مجھے سنا دیا تھا کہ آجکل کی لڑکیاں اٹھیں بھاگیں اور افسانے لکھنے بیٹھ گئیں۔ بھئی بڑے بڑے لوگوں کی کتابوں کا مطالعہ کرو۔ پڑھتے پڑھتے تم ایسا محسوس کرو گی کہ تمہارا دماغ اپنی جگہ بڑھتا جا رہا ہے۔ آگے کو سرکتا جاتا ہے۔ اور میں پھر نئی نئی کتابیں پڑھنے لگی سمجھنے کی کوشش کرتی۔ یہاں تک کہ کافی کتابیں پڑھ ڈالیں مگر بے سود ——— جب گھٹائیں چھاگئیں پھوار پڑنے لگی۔ یا بارش بن ہوئی سبزا نہا دھو پھولوں کا سنگھار کرکے اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی آنکھوں سے مجھے اشارے کرنے لگا۔ دل میں ایک قسم کی خوشی رنج گدگداہٹ سی محسوس ہوئی اور میں نے قلم اٹھایا۔ لکھا اور پھینک دیا۔ گویا جوش اٹھا امنگوں سے بھرا دل دھڑکا۔ اور ذہنی بار کو چند سطریں لکھکر اتار دیا۔ اور زندگی کو تھوڑی دیر کے لئے سکون مل گیا۔ اداس شام آئی سوگوار سی۔ اور افسردہ چہرے پر سیاہ نقاب ڈال کر سسکیاں بھرتی ہوئی ادھر ہی مڑگئی جدھر سے آئی تھی مگر دنیا اسی طرح محو تھی اپنے کھیلوں میں۔ مگر میں ہر شام کو اس کا زرد اداس چہرہ بڑے غور سے دیکھتی ہوں۔ ہواؤں میں ملی ہوئی اس کی سسکیاں میرے کان سنتے ہیں یہاں تک کہ وہ سیاہ ملگجی سی چادر کا نقاب منہ پر ڈال کر ادھر ہی مڑجاتی ہے، جدھر پرندے تیزی سے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ہر شام کتنی افسردہ و سوگوار ہوتی ہے جیسے سارے جہان میں جنازے ہی جنازے پڑے ہیں بے گور و کفن اور شام دبے دبے قدموں سے آتی ہے پُرسا دیتی ہے اور واپس مڑجاتی ہے۔ مجھے جوش چچا کا وہ فقرہ یاد آجاتا ہے۔ جب انہوں نے کہا تھا۔ یہ تم نے کبھی محسوس کیا ہے کہ شام اتنی اداس کیوں ہوتی ہے۔ مگر میں کچھ نہ بول سکی۔ میں نے نہیں کہدیا۔ انہوں نے افسردہ سا

چہرہ بناتے ہوئے کہا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ واقعی وہ تکلیف محسوس کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا۔ دنیا کی ہزاروں بیواؤں اور یتیموں کی آہوں کا اثر ہوتا ہے۔ جو شام اتنی افسردہ اور آسمان بھی سیاہ سا ہونے لگتا ہے۔ وہ آہیں ٹکراتی ہیں آسمان سے ـــــ مگر ان کا خدا ـــــ پڑا سوتا رہتا ہے ـــــ اتنی افسردہ غمگین حقیقت پر میرے آنسو آگئے اور سردی لگنے لگی مگر ان کے اس آخری فقرے پر میں بے اختیار ہنس دی جیسے شام سے صبح ہوگئی ـــــ وہ مسکرائے۔ کیوں؟ اور میں نے بھائی صاحب کی طرف دیکھ کر کہا اور آپ کے خدا کو احساس ہے اس کا۔ انہوں نے پان کھاتے ہوئے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ہاں۔ اور ان کی ہاں کمرے میں کچھ لمحے کے لئے گونجتی رہی بھائی جان ہنس رہے تھے۔ اور میں یہ سوچ رہی تھی۔ کہ انہوں نے زور سے مسکراتے ہوئے کہا ـــــ بیٹی۔ ہمارا خدا بہت بڑا ہے۔ اور اکثر تنہائی میں ہم سے سب حال کہہ ڈالتا ہے۔ اور وہ نجانے کیا کیا کہہ رہے تھے جیسے ایک بچہ اپنے کھلونے کی تعریف میں دوسروں کے کھلونوں کی توہین میں باتیں بنا رہا ہو ـــــ اور میں سوچ رہی تھی کتنے بڑے دماغ کا شاعر۔ ننھے منھے سے بچے میں کتنی جلدی تبدیل ہوگیا ہے معصوم سی باتیں، فرشتوں جیسی مسکراہٹ ـــــ ایسے میں جی چاہا کہ کچھ کہہ ڈالوں ـــــ کہ یکایک بدلیاں یاد آگئیں۔ کہ تم نے بھی تو بچوں کی دنیا کی سیر لکھی ہے، افسانوں کے پلاٹ کی دیواریں بچوں کی زبان نے تیار کیں۔ رنگ کے برش لیکر جلدی میں ننھے ننھے ہاتھوں سے بھدا سا رنگ پھیر دیا۔ کردار بچوں جیسے۔ اور رہے ہی کیا۔ خیر اب جو مرضی آئے دنیا کہے مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ ریڈیو اسٹیشن میں تین سال رہ کر۔ اپنے ہمدرد دوستوں عزیزوں کی کم باتیں سنی ہیں جواب اس کتاب کے بارے میں سنتے ہوئے خودداری کو ٹھیس لگے گی، اسے

جناب ہم تو من موجی ہیں، جب جی چاہا دل خوش کرنے کے لئے لکھ مارا۔ مجھے کیا غرض جہاں سے کسی نے کہا دیباچہ فلاں سے لکھواؤ۔ فلاں کے لکھنے سے سیل بہت ہوگی۔ اور مجھے یاد آگیا کہ کتاب میں کچھ نہیں ہے۔ فلاں کے لکھنے سے سیل ہو جائے گی۔ بالکل اس طرح جیسے ایک مشہور شاعر، لاہور میں کسی جگہ اپنا کلام اپنی مدھ بھری آواز میں سنا رہے تھے۔ جب وہ ختم کر چکے تو سامعین میں سے ایک صاحب نے بے حد تعریف کرتے ہوئے کہا "واہ جی۔ تھواڈے کی کنے اے۔ میں کہا جی خوب گا وندے او۔ ایک ہور چیز گا ئیے" (یعنی واہ جی آپ کے کیا کہنے ہیں۔ میں نے کہا جی خوب گاتے ہو، ایک اور کوئی چیز گا دیجئے۔ اب آپ ہی غور کیجئے کیا گزری ہوگی ان پر دماغ سے نکلے ہوئے اشعار کچھ نہیں تھے اُن بھائی کے لئے۔ صرف گانے کی تعریف کی تھی۔ میں نے بھی سوچا کہ چلو کتاب میں تو بکواس ہے، لاؤ کسی مشہور ہستی سے دیباچہ ہی لکھوالیں تاکہ بھئی کاغذ کتابت اور پریس کی چھپائی ہی کے پیسے نکل آئیں۔ مگر ..... بھئی شاید باجان نے گھٹی اپنے ہاتھ سے دی تھی۔ اور ان کی عادت تھی کہ لفظ خوشامد سے اتنی نفرت تھی۔ جتنی آجکل مجھے ہے۔ ——— سوچ سمجھکر ہم نے ہی لکھنا شروع کیا۔ مگر صاحب' ایں کتاب ہمہ آفتاب است' والا معاملہ ہے افسانے اس سے بڑھ چڑھ کر اور اب جو اپنے لکھے ہوئے کو پڑھا تو بے اختیار پھش کر کے پھینکدیا ——— آج دوسرا روز ہے اسے لکھے ہوئے اور یہ میری قابلیت پر آنسو بہاتا ہوا پریس میں جا رہا ہے۔ اب آپ کی جو مرضی میں آئے کہیئے، ہاں! اپنے مشفق باجان کی روح کی نذر کرتی ہوں۔ اس کتاب کو۔ کیونکہ سب سے بڑی وجہ یہی ہے میرے افسانے لکھنے کی۔ شعر کہنے چھوڑ دیئے۔ بہت کم کہتی ہوں۔ اور باجان نے چھپے لفظوں میں کہا تھا کہ بیٹا! قدرت نے تم پر ظلم کیا کہ تم کو لڑکی بنایا۔ اے کاش میرے پاس جہاں تین لڑکے میں

تم بھی لڑکا ہوتیں۔ تو میری روح بے چین نہ رہتی۔ اور پھر لڑکی ہو کر تمہاری ذہنیت تمہارے خیالات سب کچھ لڑکوں جیسے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں گیارہ سال کی تھی۔ باباجان تندرست تھے۔ صبح شام میں ان کے ساتھ سیر کرنے جایا کرتی تھی۔ وہ مجھے ہر وقت سمجھایا کرتے تھے کہ بیٹا دنیا بڑی خراب جگہ ہے۔ یہاں اپنا عزیز کوئی نہیں۔ یہاں تک کہ ماں باپ بھی اپنے نہیں ہوتے بیٹا۔ جتنے تلخ تجربے مجھے ہوئے ہیں۔ خدا تمہیں بچائے رکھے۔ نکلسن باغ میں وہ سرخ پھولوں کا درخت اب بھی ہے، جہاں باباجان اور میں صبح و شام گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے۔ جب اٹھتے تو وہ ایک پھولوں کا گچھا اپنے ہاتھ سے توڑ کر مجھے دیتے تھے۔ اور میں گھر آکر گلدان میں لگا دیتی تھی۔ اب بھی امی جان اور بھائی صاحب کے ساتھ صبح کو سیر کو جاتی ہوں اور وہی درخت دور سے نظر آجاتا ہے۔ جس کی نرم نرم شاخوں کے سائے تلے۔ سفید ململ کا کرتہ پہنے۔ نرم نرم ہاتھوں سے میرے ہاتھ پکڑے ہوئے باباجان کتنے ہی قصے سنایا کرتے تھے۔ داغ صاحب قبلہ کی روح کے لئے وہ میرے ہاتھ بھی آسمان کی طرف اٹھانے کو کہتے اور میں بھی باباجان کے ساتھ فاتحہ پڑھتی تھی۔ کس قدر عقیدت تھی باباجان کو اپنے استاد سے۔ مگر عین اسی وقت اسی سرخ پھولوں والے درخت کے نیچے میں بھی اپنے پیارے عزیز محبت بھرے دل کے مالک باپ کے لئے فاتحہ پڑھتی ہوں۔ ان کے انتقال کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اب میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ مگر ہائے یہ انسان کس قدر معصوم بچہ ہے۔ کہ کتنی جلدی اپنے کھلونوں میں غرق ہو جاتا ہے۔ اور مشیت ایک عقلمند ماں کی طرح نئے نئے خوبصورت کھلونے اپنے آزردہ بچے کے سامنے ڈالدیتی ہے۔ اور وہ ان کھلونوں کی رنگینی میں غرق ہو جاتا ہے۔ سب کچھ بھول کر۔" کس قدر عجیب ہے یہ دنیا اور اس کی محبت اور ہم۔

علامتیں خوبصورتوں کی بدلیاں ہوئی معلوم ہوتا ہے

کیوں یاد آ گئیں؟

میں دستخط کر **بدلیاں** نہیں لیں $\frac{30}{100}$ روپے جاتا ہوگا

بھی سمجھی بات ہے

آہ! آج نہ جانے میرا دل کیوں اس قدر اداس ہے۔ شائد موسم کی وجہ سے
شام کی چائے پر سب میرا انتظار کر رہے ہیں۔ کئی دفعہ شاہین بھی آئی ——
توبہ کس قدر شریر لڑکی ہے۔ میرے کان میں چپکے سے آکر اس قدر زور سے
چیخی کہ میرا بے قرار دل۔ دھڑکنے دھڑکتے بے اختیار تڑپ گیا —— اور وہ
تھی کہ دوڑ کر اپنے مٹی میں بھرے ہوئے جوتوں سمیت میرے نرم نرم سفید سفید
بستر پر چڑھ گئی —— اور اپنے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہاتھوں سے
میرے پریشان بالوں میں اپنا دو گز لمبا فراک کا ربن نکال کر باندھنے لگی ——
چھوٹے لو جی باجی۔ آپ تو بھی گندی ہو گئی ہیں —— ایسے اچھے بال،
جس میں ربن بھی نہیں باندھتی —— چلئے اب تو آپ تیار ہو گئیں۔ اب

چلئے بھی چاٹ پڑا امی کہتی ہیں آج بھیا جانی، بلی اچھی مٹھائی لائے ہیں۔ بھیا جانی بھی آپ کو بلا رہے ہیں۔ اور مجھے یہ چوکالیٹ دیئے ہیں۔ چلئے بھی لوحی باجی —— پاپا کہتے تھے تمہاری لوحی باجی اپنے کمرے میں پڑھ رہی ہیں —— تم بلا لاؤ۔ پڑھنے کا لفظ سن کر مجھے ذرا ہوش آیا۔ پلنگ پر منٹو کے افسانے بُری طرح کروٹیں بدل رہے تھے، میں نے اسی کو غنیمت سمجھا۔ اور شاہین کو پیار کرتے ہوئے۔ اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ سیاہ گھنے تراشے ہوئے بالوں میں سفید باریک سی مانگ، چمکدار پیشانی، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جو حیرت سے میری غمگین آنکھوں میں چمکیلے پانی میں تڑپتی آرزوں کو سمجھنے کی ناحق کوشش کر رہی تھیں۔ گلابی پتلے پتلے ہونٹ جو حیرت سے دائرے کی شکل میں تبدیل ہو گئے تھے۔ گرم گرم گلابی رخسار کتنی گُل ملتی تھی۔ اختر بھیا میں، نہ جانے کیوں میرا جی چاہتا کہ شاہین کو دیکھے جاؤں اسی طرح سینے سے لگا لے۔ ہر وقت اختر سے زیادہ مجھے شاہین کا خیال رہتا بازار جاؤں تو شاہین کے لئے کوئی نہ کوئی چیز لاتی، کھانا بغیر شاہین کے میں نہ کھا سکتی۔ شاہین کے چوکلیٹ خریدتے خریدتے دوکاندار سے کچھ دوستی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ دوکان میں گھستے ہی وہ مسکرانے لگتا۔ بیوقوف مرد۔ بالکل اختر جیسا۔ مگر وہ بیوقوف تو نہ تھا۔ نہ جانے ہیں تو ابتک اس کی عادت دیکھی۔ نہ جانے کب تک ایسے ہی گزرا ہی ہیں دن گذرینگے کئی دفعہ ثریا نے بھی پوچھا، ارے غضب روحی تم کتنی خوش نصیب لڑکی ہو۔ ہر مرد تمہارے آگے ہتھیار ڈالدیتا ہے۔ بھئی عجیب لڑکی ہو۔ مجھے تو تم سے رشک پیدا ہو گیا تمہارا کزن، کتنا خوبصورت ہے، وہ کتنا پسند کرتا ہے تم کو اور سچ پوچھو تو ہم نے یعنی ناہید، نزہت، انجم نے کئی دفعہ کافی ہاؤس میں اس کی میز کے سامنے

بیٹھنے کی کوشش کی۔ مگر ایکبار دیکھنے کے بعد وہ اسیطرح کافی کے کپ کے کپ خالی کئے۔ سگریٹ پیتا رہا ـــ کس غضب کی اس کی نگاہیں ہیں۔ سیاہ بڑی بڑی چمکدار جس کی پتلیوں میں سگریٹ کے پیچدار دھوئیں میں شاید تم ناچتی رہتی ہو۔ فلاسفر ہے فلاسفر۔ لڑکی یو آر ویری لکی۔ اور مجھے مجبوراً مسکرانا پڑتا۔ ادھر وہ بیچاریاں کیا جانیں یہ مرد کتنی ایکٹنگ کرتے ہیں یہ پیدائشی ایکٹر ہوتے ہیں آنکھ کھولتے ہی نہ جانے کتنے ڈراموں میں پارٹ کر چکتے ہیں ہر بار نئے روپ میں . . . زور سے گھنٹی بجی شیلا پر وہ کچھ شرماکر مسکرا گیا۔ اور ایک چمکتا ہوا شاہین جیسا چہرہ مسکراتا نظر آیا۔ ہاؤ ڈو یو ڈو۔ روحی ـــــــ اوہ! یو آر لکنگ سو سیڈ۔ وائی۔ اور مسکراتی ہوئی سیاہ بڑی بڑی شریر آنکھیں میری اداس آنکھوں میں جواب ڈھونڈ رہی تھیں۔ ادھر میں نے طبیعت سے مجبور ہو کر کھڑکی سے جھانکنا شروع کر دیا۔ میں نگاہوں کی سیاہی ان کا چمکیلا پن اودی اودی بدلیوں میں۔ مٹا دینا چاہتی تھی۔ آہ! کتنا اداس دن تھا۔ ہر چیز اداس نظر آتی تھی۔ ہوا سرد آہیں بھرتی ہوئی مجھے کچھ سنانا چاہتی تھی۔ شاید کسی اجڑے گھر کی داستان ۔ مگر اس کے سانس کی گرمی صرف رخسار ہی محسوس کرتے تھے وہ آگے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ میری طرح مجبور ہر آزاد چیز جیسے۔ دنیا آزاد سمجھتی ہے۔ کتنی مجبور ہوتی ہے۔ مجبوریے بس بالکل ایسے جیسے ایک ہرے بھرے گلزار میں ایک پر تیغ پرند۔ جو موسم بہار میں، سرسبز دنیا سے تنگ آکر آسمانی فضاؤں میں اودی اودی مٹیالی سی بدلیوں میں، نرم نرم روئی کے گالوں میں۔ اپنے بوجھل جسم کو چھوڑ دے اور بہتا ہی جائے ـــــــ جیسے ایک

زخمی پرند۔ جس میں جان ہو، مگر بے حس سا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں۔ سر چکرانے لگا۔ انگلیاں کانپنے لگیں۔ رنگ کتنا زرد ہو گیا تھا۔ میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ ایک دفعہ ہی دل گھبرانے لگا۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔ پھر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے میری آنکھیں کھول دیں۔ آسمان کتنا گہرا اودا مٹیالا سا ہو گیا تھا۔ اتنا سیاہ جیسے ہزاروں چیلیں اڑ رہی ہوں۔ ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ میرا دل محسوس کر رہا تھا، سیاہ اودے سے آسمان میں میری روح سما جانا چاہتی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے جینے کی تمنا نہیں۔ میں کبھی زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ مجھے سب سے نفرت ہے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جب میں تنہائی میں لمبے چوڑے مٹیالے سے اودے اودے آسمان کو گھورتے گھورتے تھک جاتی ہوں تو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے ..... جیسے .... جیسے میری روح نرم نرم بادلوں میں سما جانا چاہتی ہے میرا جی چاہتا ہے۔ یا تو میں ان پھولے پھولے روئی کے گالوں کو اپنی مٹھیوں میں لے کر بھینچ ڈالوں یا وہ خود مجھے آکر گھیر لیں۔ پھر میں کبھی بھی کسی چیز کو نہ دیکھ سکوں گی۔ میری بصارت میرا ساتھ چھوڑ دے گی۔ مجھے دنیا کی خوبصورت چیزوں سے نفرت ہو جائیگی مجھے کسی چیز میں امتیاز نہ ہوگا۔ میں سب کو دیکھ سکوں اور مجھے کوئی بھی نہ محسوس کر سکے میری روح بے چین ہے۔ شاید کبھی اس کو سکون حاصل ہو۔ مجھے کتنی راحت ہوتی ہے جب کسی کی روح الجھنوں سے تنگ آکر بھاگ جاتی ہے۔ تب دنیا والے کتنی آہ و

زاری کرتے ہیں۔ انہیں کتنا افسوس ہوتا ہے کہ ہم ابھی مبتلا ہیں ذہنی کشمکش میں، مگر یہ روح آزاد ہو گئی، اور اسی رشک ہیں اس کے جسم کو کتنی اذیت پہنچاتے کی کوشش کرتے ہیں، ہزاروں طریقوں سے بھاگی ہوئی روح کو بہلا پھسلا کر بلانا چاہتے ہیں مع روٹی کے چند ٹکڑوں سے، اور خود ہی کھا جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی معصوم بھوکے بچے کو روٹی کا ٹکڑا دکھا کر جب وہ قریب آنے کی کوشش کرے تو منہ چڑا کر خود کھا جائے۔ کتنے فریبی ہیں یہ لوگ، اُف اللہ۔ مجھے رونا آنے لگا۔ میرا جی چاہا خوب زور زور سے چیخیں مار مار کر روؤں۔ جمکیلی نگاہوں نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔ نیلا پردہ کچھ کسمسایا۔ اور ریڈیو کی (volume) تیز کر دی گئی۔ من کی جیت کا یہ ریکارڈ کمبخت ریڈیو والوں کو بھی اسی وقت بجانا تھا: "نگری میری کب تک یونہی برباد رہے گی — دنیا۔ دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی —" یہ ریڈیو بھی عجیب مصیبت ہے۔ جذبات سے لبریز، ایک سخت لکڑی کا ڈبہ جو مصنوعی روشنی کا مالک مگر گول گول سے پینچ کو موڑ دینے سے لچکدار آوازیں۔ سروں میں ڈوبی ہوئی تانیں۔ سرد آہیں، قہقہے، سب ہی کچھ ہے اس چھوٹی سی دنیا میں، ہم بھی کتنے خود غرض ہیں کس شوق سے دوسرے کی دنیا کی سیر کر لیتے ہیں۔ اس کی ہر بات سے ہم واقف، یہاں تک کے راز و نیاز میں بھی مخل اور پھر خفگی یہ کہ اگر کان گنہگار ہوتے، تو یہ ان کے شریر دلوں کی شرارت۔ مگر اس کا جتا ناوہ بھی تحریر میں۔ کتنے غیرت دار ہیں یہ لوگ — کسی کو کیا معلوم ان کی دنیا کتنی تاریک ہے — کتنی خوفناک مگر دنیا کی نظروں سے کوئی دیکھے۔ رنگین پردوں میں ناچتی

ہوئی مسکراتی ہوئی تصویریں۔ سب محو ہیں۔ بیخودی سی ہر کوئی کیا جانے۔ اس درد کو۔۔۔
میرے دل میں ایسی چبھن سی ہونے لگی، جیسے کسی کی تیز نوکیلی پلکیں نرم نرم سے رخسار سے
ٹکرا جائیں ـــــــ شاہین کی کتنی لمبی لمبی نوکیلی سیاہ پلکیں ہیں۔ چمکدار ـــــ سیاہ
مجھے کتنی خواہش ہے کہ وہ روئے کبھی روئے اور اس کی سیاہ چمکیلی پلکوں پر سفید
موتی جیسے آنسو یونہی سے ٹھہر جائیں ـــــــ اے کاش وہ کبھی روتی ـــــ مگر کیا
اُسے کبھی رونا نہیں آئے گا ـــــــ ہر وقت ہنسنا۔ کبھی کبھی تو رونا بھی چاہیئے۔
اگر امی یہ باتیں سن لیں۔ لڑکی کیا دیوانی ہوئی ہے، ایسی منحوس باتیں مجھے پسند نہیں۔
خدا نہ کرے میری شاہین روئے۔ اور پھر جذبۂ محبت سے مغلوب ہو کر اس کو زور سے
بھینچیں کہ شاہین کا منہ سرخ ہو جائے۔ اس کا سانس گھٹنے لگے۔ اور ـــــــ اور
سُرخ سُرخ ہونٹ کانپنے لگیں اور پھر میں ـــــــ اچھل پڑوں ـــــــ میری
تمنا جاگ اٹھے ـــــــ میں اتنے زور سے قہقہہ لگاؤں کہ امی اپنی گرفت
ڈھیلی کر دیں۔ اور شاہین کے گول گول شانوں کو بے اختیار ہلا ڈالیں، اُف لڑکی تم کو
کیا ہوا دیوانی تو نہیں ہو گئیں، اور حیرت سے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں۔ اور
شاہین کا نچلا ہونٹ اپنے ساتھی سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور سیاہ چمکیلی
نوکیلی پلکوں پر دو بے قرار آنسو کانپتے نظر آجائیں ـــــ سیاہ چمکیلی حیران نگاہیں
شاید پھر میری اداس نگاہوں کی داستان پڑھ سکیں۔ اور میں پلٹ کر دیکھوں تو
دریچے کے باہر سیاہ دھندلے سے آسمان سے بھی ہزاروں آنسو تڑپ تڑپ کر

ماں کی گود میں گر رہے ہوں اور پھر نیلا پردہ ایک آہ بھر کر منہ پھیرے اور اس کی اوٹ میں سے چمکتا ہوا چہرہ جو آنسوؤں سے تر ہو۔ اور سیاہ چمکیلا چشمہ ابل پڑے، ساری دنیا رو دے اور پھر میں بھیگی ہوئی پلکوں کی ٹھنڈک سے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں کو ٹھنڈا کر سکوں۔ مجھے کتنی خوشی حاصل ہوگی۔ کتنا سکون میری زندگی میں پیدا ہو جائے گا مگر یہ اودی اودی بدلیاں، جن کی نس نس میں ان روئی کے گالوں میں کتنا میٹھا رس ہوگا ———— آہ میرے خشک ہونٹ اب پیاس سی محسوس کر رہے ہیں ———— اے کاش میری بے قرار روح اُن اُداس اُداس سے سمے، اودی اودی بدلیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو جائے اور پھر میں کبھی شاید کسی کو اتنی یاد آسکوں، میرے عزیز چھوٹے چھوٹے بچوں کو انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کر کے بتائیں، تمہاری فلاں فلاں عزیزہ ان بدلیوں کے پیچھے غائب ہو گئیں اور پھر ننھے ننھے ہاتھ مجبوراً آسمان کی طرف بڑھا دیئے جائیں۔ اور نہ پھر یہ لوگ بیکار سے روئی کے گالوں ٹھیالی سی بدلیوں سے کسی چیز کی بھیک مانگتے ہیں آہ یہ اودی اودی بدلیاں ———— میری روح پر چھا جائیں یا میں خود اُن میں سما جاؤں، دور آسمانی فضاؤں میں ———— جہاں میں اتنے قریب سے سیاہ آنکھوں کی چمک دیکھ کر گھبرا نہ جاؤں جہاں گیلے گیلے کانپتے ہونٹ مجھ سے کچھ بھی نہ کہہ سکیں ———— اور میرے چاروں طرف ایک نیلا پردہ رقص کرتا رہے۔ باریک نیلا ٹھیالا سا کچھ اودا اودا سا سیاہ پردہ ———— جہاں سے میں ہر چیز کو دیکھ سکوں اور مجھے کوئی بھی نہ دیکھ سکے

میں خود مجسم بدلی بن جاؤں۔ جہاں جی چاہے نرم نرم روئی کے گالوں میں لڑھکتی ہوئی۔ کبھی کھیلتے کھیلتے قہقہہ لگانے لگے اور کبھی کبھی کسی برہن کے ہمراہ اس کی اُداس آہوں میں مل جائے ـــــــ اور پھر سارے آکاش پر کالی کالی اودی اودی بدلیاں چھا جائیں۔ لوگ ملہار گائیں ہمیں رُلانے کے لئے۔ دنیا والوں کو بھی پسند ہیں آنسو ۔ اے کاش میرے جیون پر یہ کالی کالی بدلیاں چھا جائیں۔ اور میری روح پاک اور مقدس بدلی میں تبدیل ہو جائے۔ میری آنکھیں جلنے لگیں ـــ ـــ ـــ چہرہ سرخ ہو گیا ـــ ـــ کھڑکی سے باہر اندھیرا تھا ـــــــ ویران سی خاموشی، سرد ہوا سسکتی ہوئی۔ دم توڑ رہی تھی ـــــــ گلاب کا سرخ پھول میری کھڑکی میں کبھی کبھی جھانکنے لگتا ـــــــ مگر میری اداس دنیا اُسے پسند نہ آئی اور وہ منہ چڑا کے پھر اپنے ساتھیوں میں مل جاتا۔ باہر بوندیں پڑنے لگیں ـــــــ میرے بھی بے اختیار آنسو نکل پڑے دوسرے کمرے میں ریڈیو کی آواز اور اونچی کر دی گئی تھی۔ خورشید اپنی دلسوز آواز میں گا رہی تھی۔ ”گھنگھور گھٹا ہے چھائی اور مجھے یاد تیری آئی ـــــــ نیلا پردہ مسکرانے لگا۔ اور شاہین جیسی کالی کالی چمکدار آنکھیں چمکنے لگیں۔ گلابی ہونٹ کانپنے لگے ـــــــ باہر کھڑکی میں گلاب کا پھول مسکرا رہا تھا گویا یہ ریڈیو پر ملکہ پکھراج اختر شیرانی کی غزل گا رہی تھی۔

جھوم کر بدلی اٹھی اور چھا گئی ساری دنیا پر جوانی آ گئی

آہ وہ اس کی نگاہ مے فروش

آہوں کے بادل

fill up blanks اگر مس صاحب اسطرح سے خالص

میں افسانہ لکھیں تو بہتر ہے

ایسے طرز پر تو قربان ہونے کو دل چاہتا ہے

اندر سے تو خوب ہے

نخرے والی

رجنی ـــــ او رجنی ـــــ اری بولتی کیوں نہیں؟ ـــــ
تونے پتا جی کی تصویر کا شیشہ کیوں توڑ دیا؟ بتا ـــــ نہیں بولے گی ـــ
کمبخت بتا ـــــ میں اس وقت اگر ہوتا ـــــ تو کم سے کم تیرا سر
ضرور پھاڑ دیتا۔ منحوس کہیں کی ـــــ مرتی بھی نہیں ـــــ

رجنی خاموش پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی ـــــ وہ ـــــ ایسے
چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو پی جانا چاہتی تھی ـــــ اس کا دل رو رہا تھا
وہ سوچ رہی تھی ـــــ جب پتا جی زندہ تھے تو ـــــ کوئی
مجھے ہاتھ تک نہ لگاتا تھا ـــــ۔ چاہے کتنی ہی بڑی سے بڑی شرارت
کرتی۔ کتنا ہی سخت نقصان ہو جاتا مگر کسی کی مجال تھی کہ کوئی ٹیڑھی نگاہ

سے بھی دیکھے۔ یہ نوبت کبھی بھی نہ آئی تھی ——— کہ اتنی بھاری بھرکم لات ———
قسور صرف یہ تھا کہ پتاجی کی تصویر کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا ——— وہ بھی اس
کا قصور تو نہ تھا کمرہ صاف کرتے وقت جب تصویریں صاف کرنے لگی تو سورن
نے شرارت سے سیڑھی ہلا دی اور اس کے ہاتھ سے پتاجی کی تصویر گر گئی۔
جان جو پیاری تھی ——— اگر وہ خود گر جاتی تو نہ جانے کتنی چوٹ لگتی مگر
اسی نے جلدی سے سیڑھی کے ڈنڈے پکڑ لئے۔ تصویر کا شیشہ تو پھر بھی لگ
جاتا ——— کمبخت کھا کھا کر کتنا موٹا ہو گیا ہے۔ اتنی زور کی لات وہ
درد محسوس کرتے ہوئے کولھے کو سہلانے لگی ——— ریشمین شلوار پر ہاتھ
ہی نہ ٹھہرتا تھا۔ ریشم کی نرمی میں اس کی چوٹ بھی ختم ہو چکی تھی۔ فرش پر پڑے
ہوئے۔ رسالہ کے حروف اس کو آج اتنے بڑے بڑے کیوں دکھائی دے
رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح عکسی شیشے سے نظر آتے ہیں۔ اس
کی نگاہوں سے دور رسالہ کے درمیان۔ ایک موتا چمکتا ہوا پردہ پڑ گیا
جس کی چمکدار کرنیں۔ آنسوؤں کے موتیوں سے پھوٹ پھوٹ کر کبھی ترچھی
کرنیں رقص کرتیں ——— کبھی کبھی غائب بھی ہو جاتیں ———
یہانتک کہ دو بوندیں رسالے پر گریں ——— ایک جھٹکے میں رسالہ بھی
اس کے ہاتھوں میں نہ تھا ——— سامنے کچھ دور زمین پہ پڑا تھا ———
ہوا کے جھونکوں سے رسالے کا ورق پلٹ گیا ——— موتے موتے

الفاظ میں لکھا ہوا تھا ——— یتیم کی آہ ——— سنسان سے
کمرے میں اس کا کوئی ساتھی نہ تھا ——— یتیم ——— وہ بھی تو
یتیم تھی ——— مگر اس کی ہمدردیاں بھی تو ہے ——— کیا وہ
پھر بھی یتیم ہے ——— ہاں اسے یاد آیا ——— پڑوس میں سرجنا
کی ماں نے ہر دفعہ یہی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ آم، جامن جب بھی سروج
کھاتی اس کی ماں کہتی ——— کیا۔ وہ سوچنے لگی ——— ہاں ٹھیک،
——— یہی کہتی تھی ——— سروج بیٹی رجنی کو بھی دو ———
بیچاری یتیم ہے ——— اُسے کتنا بُرا لگتا تھا ——— اس کا یہ فقرہ ———
کیا وہ بھوکی ہے ——— یتیم ہے ——— کیا اس کے گھر وہ
مانگنے جاتی ہے ——— اتنی ذلیل تو نہیں۔ مگر وہ یتیم جو ہے ———
اس کی نگاہیں۔ رسالہ پر پھر جم گئیں ——— یتیم کی آہ ——— اس
کی بھی ایک آہ نکل گئی ——— آہ میں بھی تو یتیم ہوں۔ مگر گھبرا کر اس نے
تاریک کمرے میں دیکھا ——— کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ صاف دروازے
چمکتی شیشہ دار تصویریں جو اس کی بے بسی پر مسکرا رہی تھیں کچھ حیران سی
اس کی بڑی بڑی پُر نم نگاہوں میں بہہ جانا چاہتی تھیں ——— کھڑکی
سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اُسے رونے پر مجبور کر رہے تھے نہ جانے
کیوں ——— کھڑکی سے باہر دور لمبی چوڑی سڑک کے اس پار سے اس

پار پر پیپل کے شکستہ پتے ناچنے کی کوشش کر رہے تھے ـــــــ اونہہ بیہودہ سا رقص۔ وہ خود بھی زور سے بول اٹھی۔ مردہ جسم اب دوسروں کو دیکھ کر خود بھی ناچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

آج میں رنجیدہ ہوں ـــــــ مگر یہ ناچ رہے ہیں ـــــــ بدذوق بوڑھے ـــــــ بادل کی گرج سے اس کے خشک لب پھیلنے شروع ہوئے۔ نوکیلی سیاہ گھنی پلکوں کی نوکوں پر ٹھہرے ہوئے آنسو اب اس کی ریشمی شلوار میں جذب ہونے کی کوشش کرنے لگے ـــــــ ہوا میں پریشان سیاہ لٹیں اب گھٹا میں مل جانا چاہتی تھیں ـــــــ مگر... وہ بھی بے بس تھیں۔ اس کی آنکھیں اب سوج گئی تھیں، اودے سیاہ سے آسمان کو دیکھتے دیکھتے اب تھک گئی تھیں ـــــــ کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے رکھے اس کی کہنیاں اب تھک گئی تھیں۔ وہ چاہتی تھی، ایک نرم ٹھنڈا سا ریشم کا بستر ہو۔ نرم ملائم سا ـــــــ جس پر وہ گر پڑے اور پھر کبھی نہ اٹھے ـــــــ وہ ابھی نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی ـــــــ جو رامو کے کرخت جملے نے رجنی کو چونکا دیا ـــــــ برآمدے میں رامو ماں سے لڑ رہا تھا۔ تم نے ہی اسے سر پر چڑھا رکھا ہے ـــــــ ہر جائز و ناجائز بات پر اس کی جانب سے بول اٹھتی ہو یہ تمہاری طرفداری کرنے سے اور بھی شہ پاتی ہے۔ سودھا حیرت سے رامو کا منہ تک رہی تھی ـــــــ

ستون کی اوٹ میں سورنا، رجنی کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے سے ——
باری باری ہر ایک کی محبت کا اندازہ لگا رہی تھی۔ رجنی کا بس چلتا تو سورنا کا
گلا گھونٹ دیتی سیڑھی ہلا کے دوسروں کو مار پٹوائی۔ اونہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں
اب بیٹھی ہے شیشے کے ٹکڑوں سے محبت کا اندازہ لگانے۔ بیوقوف ——
تصویر کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ بن جائے گا۔ تو نے جو اس کے لات ماری۔ تو کیا اس
سے شیشہ جڑ گیا۔ بھلا سوچ تو برابر کی بہن۔ ہر وقت لڑائی دنگا جو بیس گھنٹے
سوائے اس کے اور کچھ بھی آتا ہے۔ دیکھو ماں، رامو نے پھر اسی لہجے میں
بنکارنا شروع کیا۔ تم ہر بات میں مت بولا کرو۔ ہزار دفعہ تمہیں منع کیا۔ یہہ
ہر وقت کا لاڈ۔ دیکھو کیا رنگ لاتا ہے . . . . گرم گرم . . . . سے
دو آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ اس کا کوئی بھی تو نہیں۔ رامو ایک
سال ہی تو بڑا ہے۔ مگر دیکھو کتنی حکومت جتاتا ہے۔ کیونکہ وہ مرد ہے۔ یہ غریب
مجبور سی عورت جو شیشوں کے ٹکڑوں میں انسان کی محبت ڈھونڈھ رہی ہے
نادان، بھولی، اور یہ مرد، جو مجبور سے انسان کے دکھی دل کو، کچوکے دے دے کے
مسکرانا جانتے ہیں۔ بے وقوف، سنگدل، کتنی نادان ہیں وہ عورتیں جو
پتھروں کی دیکھ بھال میں اپنے ہیرے کی چمک کھو دیتی ہیں ——
کاش —— کاش میں اتنی مجبور نہ ہوتی —— اس کے گلابی
رخسار اور بھی سرخ ہو گئے —— گلابی ہونٹ کپکپانے لگے ——

نیلے ٹیالے سے آسمان پر ہلکے پھلکے روئی کے گالے معصوم سے بادل
ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے نجانے کہاں جا رہے تھے ـــــ
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کی پیچ دار لٹوں سے آنکھ مچولی کھیلنا چاہتے
تھے۔ معصوم سے ساتھی، معصوم سے ساتھی کا دل بہلانے کی کوشش
کر رہے تھے۔

زمین پر پڑے ہوئے رسالے کے ورق اس طرح ہوا سے الٹ رہے
تھے۔ جیسے کوئی نادان تصویروں کی کتاب کی نئی نئی تصویریں دیکھنے کے شوق
میں جلدی جلدی الٹنے کی کوشش کر رہا ہو ـــــ مگر اس کا تو ابھی دوسرا
ہی ورق الٹا تھا ـــــ وہ یاد کرنے لگی۔ پتا جی۔ کتنی بے چینی سے سکول
سے میری واپسی کا انتظار کرتے تھے۔ جب تک رجنی کھانے پر شریک نہ ہو
ان سے کھانا نہیں کھایا جاتا تھا کتنے دن گذرے۔ وہ کتنی چھوٹی تھی پتا جی
کی کیسی شکل تھی۔ کئی لوگوں کو کہتے سنا تھا۔ رجنی کی تو بالکل بنی بنائی اپنے
پتا کی شکل ہے۔ شاید اسی وجہ سے کئی دفعہ وہ سوتے سوتے کسی کے گرم
گرم سانس محسوس کرتے ہوئے راتوں کو اٹھ جاتی تھی۔ مگر وہاں تو اس کی
ماں نظر آتی۔ اس وقت اس کو کتنا پیار آتا تھا۔ ماما جی اسے جاگتا دیکھ کر منہ بنا کے
کہہ دیتی۔ تم کتنی بری طرح سے سوتی ہو۔ سارا لحاف تو پلنگ کے نیچے پڑا ہوا
ہے۔ میں تمہیں اوڑھانے آئی تھی۔ کتنے اچھے دن تھے۔ جب وہ بالک تھی

انجان، کون سی ایسی خواہش تھی جو پوری نہ ہوئی ہو ——— فضول بے کار سہی۔ پتاجی وہ کھلونا لوں گی۔ بڑی سی گڑیا لا دو۔ ایسا جو تا نہیں پہنوں گی سرلا کی دیدی جیسا میں بھی لوں گی۔ کتنی بیوقوف تھی۔ اور اب ایک آرزو میں سال بیت جاتے ہیں۔ اس کا دل بھر آیا۔ آنسو رکتے ہی نہ تھے۔ ہاتھ کانپ رہے تھے دل دھڑک رہا تھا۔ ہچکیاں بندھ گئی تھیں دوپٹہ کا پلو تر ہو چکا تھا۔ یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کسی اور کا دل بھی دھڑک رہا ہے۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اُسے سینے سے لگاتے ہوئے اس کے آنسو پونچھ رہا ہے۔ مگر آنسو پونچھنے والے کے آنسو اسکے منھ پر گر رہے ہیں جیسے وہ اس کی تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے خود رو رہا ہے۔ مگر اس کے دکھتے ہوئے دل کو تسکین دینا چاہتا ہے۔ رومال میں سے اس نے کے پتا کی خوشبو سی محسوس ہوئی۔ وہی حنا کا عطر جو انہیں بے حد پسند تھا۔ وہ چیخ اٹھی پتاجی پتاجی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں ——— کھڑکی کا دروازہ اس کی کہنی پر لگا۔ باہر زور کی بارش ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں بندھی ہوئی چک کی ڈوری میں سے بارش کا پانی رس رس کر قطروں کی صورت میں اس کے رخسار پر بہہ رہا تھا۔ وہ کانپ گئی کمرے میں اندھیرا تھا دوسرے کمرے سے رامو کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ ساون کے نظارے ہیں، اہا اہا۔ اس نے

اپنی ڈبڈبائی نظریں مٹیالے سے آسمان پر گاڑ دیں ایک سرد آہ اس کے
کانپتے ہوئے لبوں تک آئی ——— اس کے مختصر کمرے میں ...
دیواروں سے ٹکراتی ہوئی دور آسمانی فضاؤں ——— اور کالے
کالے بادلوں میں غائب ہو گئی ———

دھواں

1/4 / 100

[illegible]

[illegible]

~~you are all fools~~

Don't write any thing on this book
It is not your rough
copy Mr 420

"مس صاحب۔ ذرا آگے سے ہٹ جائیں"۔ لوئس پھر اسی بارونق سڑک پر تھی —— تیزی سے دوڑکر وہ فٹ پاتھ پر چلنے لگی —— اسی طرح مریل سی چال میں ڈوبی ہوئی —— بیچاری لوئس —— وہ گھبرا کر میٹھی میٹھی نگاہوں سے گذرتے ہوئے —— خوش پوش بے فکروں کو دیکھنے لگتی —— کتنی نظریں مسکراتی ہوئی —— پاس سے گذر جاتیں —— کیا مصیبت ہے یہ بیوقوف مرد —— او نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتے —— مجسّم غلط فہمی —— وہ یہی سوچتی ہوئی۔ اپنے خوبصورت سینڈلز دیکھنے لگی۔ واقعی —— میرے موٹے موٹے پیروں میں کتنے اچھے لگتے ہیں —— اور یہ سڈول ابھری ہوئی پنڈلیاں —— مگر اس کو اپنی رائے بدلنی پڑی —— سامنے سے ایک اینگلو انڈین مس صاحبہ

کسی ٹومی کے ساتھ چہل قدمی کرتی ہوئی نظر آئیں ـــــــ اس کے گورے
گورے خوبصورت پیروں میں پرانے ڈیزائن کے سینڈلز جواب بہت ہی
COMMON ہو چکے تھے کتنے اچھے لگتے تھے۔ اپنے سانولے رنگ کے
پیروں کو دیکھ اس کے دکھے ہوئے دل میں ایک ٹھیس سی لگی ـــ اے کاش
میں بھی خوبصورت لڑکی ہوتی۔ مگر کسی خیال سے وہ چونک پڑی۔ اگر میں خوبصورت
ہوتی ـــــ اگر میں خوبصورت ہوتی، تو ـــــ تو گرینی مجھے کبھی بھی نوکری نہ
کرنے دیتی ـــــ اور، اور نا ہی اتنا پڑھا لیتی ـــــ اور صبح شام کی سیر، یا تو
ختم تھی۔ یا پھر گرینی کے ساتھ ـــــ سائیکل کی گھنٹی کی آواز سن کر۔ اس
نے مڑ کر دیکھا ـــــ آج آپ بہت اداس ہیں شاید ـــــ پاس سے گذرتے
ہوئے۔ ایک چرکٹے حضرت جن کی مونچھیں بالکل ایسی تھیں جیسے ؛ جیسے وہ سوچنے
لگی کیسی وضع تھی اس لفنگے کی مونچھوں کی ـــــ ہاں ـــــ ہاں۔ وہ چیخ اٹھی،
کل جب ایلس کی چوڑی کھانے کی میز پر طبلہ بجانے کی مشق میں ٹوٹ گئی تھی دو ٹکڑے
جیسے باریک چاند کے دو ٹکڑے ـــــ کسی انجان نے کھیلتے کھیلتے چاند کے
دو ٹکڑے کردیئے ہوں ـــــ مگر یہاں۔ اُس لفنگے کی مونچھیں چاند جیسی کٹی ہوئی تھیں،
مگر چاند کی طرح شفاف نہیں۔ سیاہ کالی، بالکل ایسی جیسے مونچھوں والوں کے دلوں
کا رنگ جیسے ـــ موٹے موٹے سگریٹ کے دھوئیں سے سیاہی مائل ہونٹ ـــــ
ہونٹ۔ سیاہی مائل۔ اس کو اپنے خشک ہونٹوں کو شیشہ میں دیکھنے کی ضرورت محسوس

ہوتی۔ مگر اس کو PURSE پرس سے سخت نفرت تھی۔ پھر شیشہ رکھے تو کہاں ــــ
اس کو بے چینی سی پیدا ہو گئی ـــــ شیشہ۔ سوکھے ہوئے ہونٹ، مرجھائے
ہوئے ہونٹ جن کو زمانے کی سرد ہواؤں نے خشک کر دیا ہو ـــــ کافی ہاؤس
چلنا چاہیئے۔ دروازہ کھلتے ہی کتنا بڑا شفاف سا آئینہ لگا ہوا ہے ـــــ جس میں
میزوں کے چاروں طرف لال لال چہرے خاکی وردی میں ملبوس جسم۔ سگریٹ کے سرمئی
رنگ سے پیچ دار ـــــ گول گول ـــــ سرمئی رنگ کے۔ کیسے نرم نرم ملائم
سے خم دار دودِ سیاہ جو بڑھتے بڑھتے۔ نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے تھے۔ اسے
سگریٹ کی بو سے سخت نفرت تھی۔ جہاں کہیں کوئی سگریٹ جلائے تو اسکا سانس
گھٹنے لگتا تھا ـــــ مگر نہ جانے اس کا ٹمیالا سا سرمئی۔ سیاہ سا پیچ دار دھواں
ـــــ کتنا لطف آتا تھا اس کو۔ اس دھوئیں کے دیکھنے میں۔ جب وہ تخئیلات کی
دنیا میں سر گرداں پھرتی ہو ـــــ بھاگتی دوڑتی۔ نڈر۔ وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔
اس معصوم دنیا میں۔ سب کچھ اس کا جی چاہتا کہ اس کے سامنے اندھیرے
کمرے میں۔ ایسے اندھیرے کمرے میں، ایسا اندھیرا۔ جب آسمان پر سیاہ اودی
اودی ٹمیالی سی بدلیاں چھا جائیں۔ اور دنیا کے اوپر باریک سی سرمئی رنگ کی چادر
ڈالنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ پرندے خوفزدہ سے اپنے اپنے آشیانوں میں ننھے ننھے
دھڑکتے ہوئے دل لئے واپس لوٹتے ہوں ـــــ ٹھنڈی ٹھنڈی۔ سرد ہوا کے
جھونکے ـــــ دریچے کے پردوں سے اٹکھیلیاں کر رہے ہوں، ایسے اداس

سے سہے۔ ایسے خاموش سے کمرے میں۔ اس اندھیرے میں ـــــ کوئی اس کے
سامنے بیٹھا رہے۔ سگریٹ کے مٹیالے دھوئیں میں خود کو چھپائے ـــــ
بے حس سا ـــــ پریشان سے بال ـــــ مجسم درد ـــــ لمبی لمبی
کمزور سی خوبصورت لرزتی ہوئی انگلیوں میں کانپتی ہوئی شکسپیر کی رنگین زندگی کی
تصویریں۔ تھرکتی ہوئی۔ گذرتی رہیں۔ سگریٹ کے مٹیالے پیچ دار دھوئیں میں ـــ
اور وہ یونہی بے حس سی۔ مردہ ـــــ زندگی کی تصویریں مردہ ڈھانچہ ـــــ
نرم نرم گدوں دار کرسی میں دھنسی پڑی رہے ـــــ بجھے ہوئے جذبات
کو ـــــ اور بھی ـــــ گرم گرم پاک آنسوؤں سے بجھا دینا چاہتی
تھی ـــــ نہ جانے کیوں ـــــ یہ اس کی بھی سمجھ میں نہ آتا تھا ـــــ
وہ چاہتی تھی ـــــ کسی کی بڑی بڑی معصوم سی چمکدار آنکھوں میں۔ ایسی چمکدار
آنکھوں میں۔ جن کے جام ہمیشہ لبریز ہوں ـــــ اور جو چھلکنے کے لئے بے قرار
ہوں ـــــ وہ ان شفاف نگاہوں کے مچلتے ہوئے چمکیلے چشمہ میں سے ـــ
نہ جانے کیا ڈھونڈنے کے لئے بے قرار ـــــ رہتی ـــــ اوہ ـــــ
وہ ایک جھٹکے کے ساتھ ـــــ اچھل پڑی۔ سوری ـــــ
پاس سے گذرتے ہوئے۔ ایک خوش شکل نوجوان نے مسکراتے ہوئے۔ کہا ـــــ
لوئس کے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ نوجوان اس وقت اپنے بازوؤں کو جھاڑنے میں
مصروف تھا ـــــ اس کے خم دار ابرو ـــــ جیسے چاند کے

دو ٹکڑے ـــــ الگ الگ لگا دیئے گئے ہوں ـــــ اور ان کی
نوکیں۔ نیچے کی طرف جھکی ـــــ لمبی لمبی سیاہ نوکیلی پلکوں کو ایکبار ـــــ
صرف ایک بار چوم لینے کی خواہش لئے ہوئے تھی ـــــ مدت سے اور نہ جانے
کب تک اسی انتظار میں تھی ـــــ وہ سوچنے لگی ـــــ کیا میرے کپڑے
خراب ہیں ـــــ یا میرا جسم یعنی میرا گداز سا بازو ـــــ یکایک اس
کے سامنے ـــــ نارائن دیوی کا وہ بدبودار سُرخ رنگ کا ٹیالا سا لہنگا ہوا
میں اڑنے لگا ـــــ اور اس کی سیاہ رنگ کی موٹی موٹی پنڈلیاں جن
میں چاندی کے جھانجن ـــــ جو ہمیشہ خوشی سے ناچتے رہتے ـــــ
کیا آپ ناراض ہو گئیں ـــــ اس کے خم دار ابرو اور بھی تن گئے' اس نے
غصے سے اپنے انجان ہمدرد کی طرف دیکھا۔ اونہہ بیہودہ سا انسان ۔ وہ سچ مچ ۔
اپنے سلک کے رومال سے اپنا منہ پوچھنا بھول گیا۔ نامعقول سا انسان ـــــ
میں کب تجھے پسند کرتی ہوں۔ بے وقوف ـــــ پاجی ـــــ اس کے
کالج کا بیوقوف سا کیشتر یاد آ گیا ـــــ جو ہمیشہ پہلی دوسری کو سونے کی
گھڑی لگا کر آیا کرتا تھا ـــــ اور او اسے روپے گنتے وقت۔ گرمی محسوس کرتے
ہوئے اپنی قمیص کے سفید کف کو بار بار الٹنے پر مجبور تھا ـــــ اور کف کے
نیچے سے ایک خوبصورت گولڈن واچ مسکراتی ہوئی نظر آ جاتی ـــــ اس کے
ساتھ ہی گھڑی کا مالک بھی مسکرا کر روپے گننے لگتا ـــــ چھچھورا سا انسان

کل ہی کی تو بات تھی۔ جب ہم اپنی تنخواہ لینے اس کے کمرے میں گھسے ــــ اس سے پہلے وہ لال پیلا رنگ کئے ہوئے چپراسیوں سے لڑ رہا تھا ــــ پڑھنا نہ جانے ایک لفظ ــــ تنخواہ لینے آجاتے ہیں۔ ہنھ۔ اس نے اپنی لمبی سی ناک کا ایک سرا۔ اونچا کر کے کہا۔ اور ہمیں دیکھ کر ــــ وہ ریشمی سرخ رومال سے منہ پونچھتے ہوئے آگے بڑھا ــــ ہلو مس لوئس ــــ اوہ مس شرما ــــ ہاؤڈو یو ڈو .How do you do ــــ اور اس نے مسکراتے ہوئے ساری پروفیسرز کی مزاج پرسی کرتے ہوئے کرسیاں پیش کیں ــــ آپ لوگ تشریف رکھیئے میں ابھی فارم لایا ــــ (THANKS) تھینکس مس شرما اور او میتا سین نے کرسیوں پر بیٹھتے ہوئے کہا ( )

بے بی۔ مس شرما نے اپنی سرمہ کی دنبالہ دار آنکھوں کو بھراتے ہوئے میری اداس نگاہوں میں دیکھتے ہوئے۔ میرے گوشت سے ابھرے ہوئے ہاتھ پر ایک باریک سی چٹکی لیتے ہوئے کہا TAKE YOUR SEAT سٹ ڈاون بے بی ــــ میں بھی مسکرا دی ــــ کاش میرے تخیلات کی کوئی قدر کرے۔ میری بے چین دنیا کے طوفانوں میں۔ کوئی ایک منٹ تو ٹھہرے۔ لاپرواہ انجان معصوم سی لہریں جب میرے سنسان سے ساحل سے ٹکراتی ہیں ــــ تو ــــ اس کا درد اس کی جبین میری بے قرار آنکھوں میں سما جاتی ــــ شاید اسی وجہ سے برجیت کنول نے مجھے چھیڑتے ہوئے اکثر ــــ کالج گراؤنڈ کے سنسان حصے میں جہاں ہم اکثر

دو دو گھنٹے یونہی، امرود کے پیڑ کے نیچے ——— نہ جانے کیا کیا بکواس کیا کرتے تھے

——— اور پکے پکے امرود ——— امرود ——— سفید بے داغ۔ ہرے ہرے

جن کے رخساروں پر ننھے ننھے سرخ دھبے ہرے ہرے پتوں میں سر جھکائے ہماری

ہی باتیں کس شوق سے سنتے تھے۔ اور۔ وہ نامراد ——— کوئل۔ ٹھیک ہمارے

آتے ہی ——— کوکنا شروع کر دیتی ——— اس کے پروں کو دیکھ کر نہ جانے

مجھے پھر سگریٹ کا دھواں کیوں یاد آ جاتا ——— مٹیالا سا نرم ریشم جیسا ———

اندھیرے کمرے میں۔ جہاں دریچے سے، دم توڑتے ہوئے سورج کی وہ اداس سی کرنیں

جنکی مدھم روشنی ——— صرف سگریٹ کا دھواں سنہری پریشان سے بال

——— جن کی چمک ——— کچھ آنکھوں کی پتلیوں میں بھی آ جائے ———

گلابی مگر خشک سے ہونٹ ——— لرزتی ہوئی لمبی لمبی نازک سی انگلیاں ———

جو ایک بے جان ہلکے ہوئے سگریٹ کو بھی نہ تھام سکیں ——— وہ ایک بار صرف

ایک باران لمبی لمبی کمزور سی انگلیوں کو پکڑ کر زور سے مروڑ دینا چاہتی تھی وہ جاننا

چاہتی تھی کہ وہ لرزتی ہوئی پتلی پتلی لمبی نازک سی انگلیاں کتنی لچکدار ہیں۔ شاید یہی سوچتے

ہوئے اس نے ایک نئے سگریٹ کو تھوڑا سا خالی کر دیا تھا ——— جس سے

وہ اور بھی لجلجا ہو گیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ، ایکبار ان لرزتی ہوئی کانپتی ہوئی انگلیوں

کو چھونا چاہتی تھی۔ اس طرح ——— جیسے، کل جب وہ امرود کے پیڑ کے نیچے

لنچ ٹائم میں سرجیت کے ساتھ کھانا کھا کر امرود کے پیڑ کی جڑ کے پاس ہاتھ دھوتے

ہوئے۔ زور سے چیخ اٹھی تھی۔ بدن میں ایک سنسنی سی پیدا ہو گئی تھی وہ اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں کو دانت میں بھینچنے لگی تھی۔ اس کے بعد وہ دن بھر نہ ہنسی، مگر اس نے چلتے دفعہ آہستہ سے ڈرتے ڈرتے مری ہوئی کوئل کو جس کے پر سگریٹ کے دھوئیں جیسے مٹیالے تھے، کھلے ہوئے بے جان پر، وہ کئی دفعہ جھکی اور ہمیشہ ڈر کر ایک دفعہ کانپتے ہوئے آنکھیں بند کر کے۔ اس کے مردہ جسم کو اپنی لمبی لمبی کانپتی ہوئی انگلیوں سے چھو ہی لیا۔ نرم نرم سے پروں میں سخت سا جسم —— اس کے سارے بدن میں کپکپی سی پیدا ہو گئی تھی —— اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ وہ سارا دن ہنس سکی نہ جانے کیوں۔ فلاسفی کے پیریڈ میں وہ کتاب سامنے رکھ کر —— وہ تھکی تھکی نگاہوں سے سفید سفید چمکتی ہوئی پیشانیوں کو گھورنے لگی۔ ایک دفعہ ہی وہ چونک پڑی۔ اس کے سامنے پروميلا ہلکے سرمئی رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس —— چاک سے اپنی میز پر تصویر بنانے میں مشغول تھی۔ اور بھی چند لڑکیاں چاک سے اپنے نام کے پہلے لفظ کو بنا بنا کر لکھنے کی مشق کر رہی تھیں۔ نہ جانے اس کی آنکھوں میں کیوں آنسو آ گئے —— اس نے لرزتی ہوئی آواز میں یہ فقرہ کہا "ایکسکیوز می گرلز" اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کتنا اداس دن تھا سرمئی مٹیالی سی بدلیاں تھیں جو ایک جہان پر چھائی جاتی تھیں۔ اس کا دل گھبرانے لگا —— وہ چونک پڑی سامنے سے تین صاحب زادیے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے ڈبے لئے ہوئے۔ آپس میں موجودہ فیشن پر رائے زنی کرتے ہوئے پاس سے گذرنے

بوٹ پالش ـــــ مگر پھر کپڑے کے سینڈلز دیکھ کر مسکرا کر رہ گئے ـــــ
جیب سے بیڑی کے بجھے ہوئے ٹکڑے نکال کر ـــــ بیڑی پینے کی مشق کرنے
لگے ـــــ میلی پھٹی ہوئی قمیصوں میں سے تنے ہوئے چھوٹے چھوٹے سینے ابھارتے
ہوئے ،ذرا یونہی سا گنگنانے لگے تم روٹھ گئیں روٹھ گئیں او ہو تم روٹھ گئیں ، اس نے مڑ کر دیکھا
ان میں سے ایک صاحب زادے جو دو سے بڑے تھے ۔ایک آنکھ میچتے ہوئے نظر
گئے ۔وہ حیرت سے لمبی چوڑی سڑک پر دیکھنے لگی ـــــ پریشان سی ـــــ وہ
اب عنقریب رونے والی تھی ـــــ مگر یکایک اس کو ہرے رنگ کے بڑے
بڑے دروازے آدھے کھلے سے ملے ـــــ شاید وہ مسکرا رہے تھے ۔ اس کی بکیسی
پر ـــــ وہ تیزی سے بڑھی اور وہ تیزی سے سانس لے رہی تھی ـــــ
ہیلو۔ ہاؤ ڈو یو ڈو ـــــ وہ پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی ـــــ اس کے
پاس تو کوئی سرخ چیز بھی نہ تھی ۔فراک نیلی تھی اور سینڈل بھی نیلے تھے سرخ تو نہ تھے
پھر ـــــ ایک سیٹی کی آواز نے چونکا دیا ۔ وہ مڑی ایک صاحب پینٹ کی جیبوں میں
ہاتھ ڈالے اکڑتے ہوئے پاس سے نکل گئے ۔ وہ گنگنا رہے تھے ۔ اے دل مجھے رونے
دے ، اے دل مجھے رونے دے ـــــ وہ مسکرا دی اس کا بے اختیار جی چاہا
کہ زور سے چیختی ہوئی بھاگتی ہوئی گذر جائے اور ایسا زور سے ان کے کلین فیس پر ایک
چپت لگائے کہ یاد ہی تو رہے ' اے دل مجھے رونے دے' اس وقت یہ گاتے ہوئے
کتنے اچھے لگیں گے جناب جب آپ کی شکل بھی رو رہی ہو ـــــ مگر نہ جانے کیوں نہ

بھاگ سکی ـــــــ آخر تھا نا اس ہی ہندوستان کا خون۔ اگر رنگ بھی سفید ہوتا تو مجال تھی کسی کی جو اس کو کوئی رستے چلتے چھیڑ بھی دے مگر اِس سانولے رنگ میں بھی نہ جانے کیا کشش تھی۔ وہ خود حیران تھی ـــــــ جوزف کتنا ہینڈسم ہے بھوری بھوری شفاف سی چمکیلی آنکھیں، جیسے کچھ کہہ رہی ہوں شرارت سے پُر آنکھیں ـــــــ بی، اے کر کے بھی ابھی تک شرارتیں ایسی ہی ہیں جیسے آٹھویں نویں کلاس میں پڑھنے والا شریر لڑکا ـــــــ مگر اس کی نگاہیں ایسی کیوں ہیں ـــــــ جیسے جیسے ـــــــ دیکھتے دیکھتے ہی وہ اپنے اندر کھینچ لیں گی دنیا کی ہر ایک چیز اس کی ساری مسکراہٹ اس کی نگاہوں میں سمٹ کر آجاتی ہے۔ اوہ گوڈ۔ وہ ذرا سا منہ بنا کر رہ گئی جیسے کڑوی دوا پی لی ہو۔ مگر پاس سے گذرتے ہوئے خوش پوش بے فکروں کی ٹولیوں سے وہ گھبرا گئی۔ اور چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ فٹ پاتھ سے اترتے وقت اس کا پیر مڑ گیا تھا۔ وہ اس موچ کو بھی بھول گئی تھی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نظر آ رہی تھیں۔ اس کا جی چاہا کاش اس وقت جوزف میرے ساتھ ہوتا، میں پھر کتنی بے تکلفی سے چلتی، ان شریف لفنگوں کے دبے دبے قہقہے سن سکتی۔ آہ جوزف۔ مگر وہ کس قدر لاپرواہ ہے کتنی مدت ہو گئی مگر میں اس کو اب تک نہ پہچان سکی۔ اس کا بھی کیا قصور۔ اس کی دولت کا قصور۔ کاش وہ امیر نہ ہوتا۔ اس کی بہنیں کتنی مغرور ہیں۔ میں جوزف سے مل کر کتنی خوشی محسوس کرتی ہوں۔ مگر اس کا یہ فقرہ سن کر میری ساری خوشی خاک میں

ماں جاتی ہے۔ میرا سارا خون خشک ہو جاتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کل میرے گھر آؤ۔ شام کی چائے یہیں پی لینا۔ ہائے رے کیسے بتاؤں اس کو۔ اس کا وہ شاندار ڈرائنگ روم بڑے بڑے ہال، وہ شاندار سی کوٹھی، وہ قیمتی قیمتی فرنیچر وغیرہ۔ اس روز جب میں ماما کے بے حد مجبور کرنے پر گئی تو ڈرائنگ روم دیکھتے ہی میری ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ رنگ سرد ہو گیا تھا۔ سر بس چکرانے لگا تھا اگر جوزف نہ تھام لیتا۔ کتنے پیار سے اس نے جھک کر پوچھا تھا۔ اوہ ارائن تمہیں کیا ہوا۔ طبیعت کیسی ہے۔ وہ گھبرا سا گیا تھا۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی کہ اس کو میرا کتنا خیال ہے۔ مگر پھر اس کی دولت کا خیال آتے ہی مجھے نفرت سی ہونے لگی میرا جی چاہا جوزف کا ہاتھ پکڑ کر بھاگتی چلی جاؤں دور جہاں کوئی بھی نہ ہو۔ جہاں اس چیز کا امتیاز نہ ہو کہ یہ لڑکی غریب ہے اور یہ لڑکا امیر ہے لڑکی کوئی خاص خوبصورت نہیں۔ نہ جانے جوزف کو کیا ادا پسند آئی۔ دنیا میں ہزاروں خوبصورت لڑکیاں ہیں آخر اس سانولی سی رنگت میں کیا نظر آیا۔ اور وہ اس کی بہنوں کی طنز آمیز مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے کئی دفعہ جوزف سے کہا بھی تھا کہ جوزف تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ اس دنیا میں ہزاروں نازک اور خوبصورت پھول ہیں۔ جو تمہارے قیمتی کوٹ پر بے حد اچھے لگیں گے صرف فرق اتنا ہوگا کہ ان میں سے تھوڑی دیر بعد خوشبو آئے گی۔ جب وہ تمہارے قیمتی کوٹ کو دیکھیں گے مگر بناوٹی خوشبو ہوگی۔ تو اس سے دنیا کو کیا مطلب تمہارے خاندان کو اس سے کوئی مطلب نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تمہارے قیمتی کوٹ پر خوبصورت سا پھول نظر آئے تاکہ دنیا

اسے دیکھ سکے۔ اور تمہاری بہن خوشی سے ناچتی ہوئی پھول والا ہاتھ چھوڑ کر خالی ہاتھ
میں جھولتی ہوئی اس دنیا کی منزل پر چلیں ——— میرے جوزف تم اس پھول کو
چھوڑ دو۔ جو ایک کٹیا کی کیاری میں تمہیں نظر آیا۔ تم کسی شاندار کوٹھی میں سے خوبصورت
سا پھول توڑ لو ——— اس کٹیا کے پھول میں تمہاری ہی مہک رہے گی اور آخر
تک وہ کسی انسانی قدموں میں نہیں گرے گا۔ بلکہ تمہارے دھیان میں مست اپنا
جیون دیوتا کے قدموں میں نچھاور کر دے گا۔ اور اس کی سوکھی ہوئی پنکھڑیاں مندر
کے منڈل کے چاروں طرف زمانے کی ہواؤں سے ادھر اُدھر بکھری بکھری پھریں
گی۔ صرف اس انتظار میں کہ تم آؤ مندر میں دیوتا کی پوجا کے لئے۔ ایک تازہ خوبصورت
پھول کے ساتھ۔ اور دیوتا کے چرنوں میں جھکنے سے پہلے۔ اس پھول کی منتشر
پنکھڑیاں یک جا ہو کر۔ تمہارے چرنوں میں ہوں گی۔ کتنا اچھا کتنا شبھ سما ہو گا۔
جب ایک پھول اپنے دیوتا کی پرستش کرتے کرتے اپنے دیوتا کے چرنوں میں سسکتا
ہوا آخری سانس لے رہا ہو۔ اور اس کا انسانی دیوتا اپنے مذہبی دیوتا کو یونہی چھونے
آ گیا ہو۔ دنیا کے ڈر سے، پوں پوں نہ جانے ہارن کی آواز کب سے سنائی دے رہی
تھی۔ جیسے دور بہت دور کوٹھی کے پچھلے کمپاؤنڈ میں کوئی بچہ ایسے ہی بھاگتے بھاگتے
بھونپا بجا رہا ہو۔ پوں پوں ——— پوں اور بھاگتے ہوئے اس سے آ کر اس کی
سانولی سانولی ٹانگوں میں لپٹ جائے۔ اور اس کے سارے جسم میں ایک جھٹکا سا
لگا۔ اور وہ خود کو روکتے ہوئے بھی سڑک پر گر پڑی۔ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے

چاروں طرف سگریٹ کا دھواں ہی دھواں آ سے گھیرے ہوئے ہے۔ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ اندھیرے کمرے میں جہاں ایرکنڈیشن سسٹم ہے۔ اندھیرے زینے میں اُترے چلی جا رہی ہے۔ جلدی جلدی، حیرت ہے بغیر کسی سہارے کے اتری چلی جا رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی دیواریں اس کی پیشانی پر جیسے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی بہہ رہا ہو ——— اور پھر وہی ٹمیالا سا سگریٹ کا دھواں لمبی لمبی کمزور سی نازک سی پتلی پتلی انگلیاں۔ جو ایک نرم نرم پہلچے سگریٹ کو بھی نہ تھام سکیں سنہری پھولے ہوئے بال کرل سے جن کا سنہرا پن۔ آنکھوں کے نشیلے پن پر چھا جائے۔ آہ۔ جوزف کی وہ نشیلی سی بے تاب نگاہیں۔ مگر آہ کاش وہ امیر نہ ہوتا ہیا تو پرُاس روز اس کی لمبی لمبی لرزتی ہوئی انگلیاں۔ جیسے تڑپتے ہوئے دل کی بے چینی اس کی ٹیس ——— مدھر سے نغموں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کی کئی دفعہ ہاتھوں کی مٹھیاں بند ھ گئیں۔ تھرکتی ہوئی مچلتی ہوئی لرزتی ہوئی متعدد کالی لکڑیوں پر لمبی لمبی سانولے رنگ کی کمزور سی انگلیاں مگر وہ ان کو چھو نہ سکی۔ سگریٹ کے ٹمیالے سے دھوئیں میں ناچتی ہوئی جوزف کی آنکھیں اسی پر مسکرا رہی تھیں اس کے شاندار ڈرائنگ روم جس کے قالین پر پاؤں رکھتے ہی اندر گھس جاتے تھے۔ اس کے گدیلے صوفے جس میں اس کی اس قدر ٹھگنی گڑیا بھی گھس جاتی تو نظر نہ آئیں کس قدر نرم تھے صوفے کے بازو کہ اگر ان پر کہنیاں ٹیک دو تو پتہ بھی نہ لگے کہ ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ اور وہ گول گول قیمتی ریشم کے چھوٹے چھوٹے صوفے پھر پڑے ہوئے تکیے جن کی جیسے ضرورت ہی نہ ہو۔ جو ہے ان غریبوں کو موڑتا ہی رہتا ہے

ایک روز تو اُس نے اس چھوٹے سے تکیہ کو مسکرا کر اپنے سینے سے لگا کر زور سے بھینچ
دیا تھا جیسے وہ بھی کوئی چھوٹا سا خوبصورت بچہ تھا۔ کہ پکڑ کر دبوچ لیا اور اتنا بھینچا کہ وہ
غریب اپنا نازک سا نچلا چھوٹا سا ہونٹ نکال کر رونے لگے۔ مگر، اف۔ اس کے سر میں
جلن سی ہو رہی تھی اور جیسے وہ کسی کی گرم سی پتلون پر اپنے ہاتھ رکھ لیتی ہے۔۔ اور
اس کے چاروں طرف زور زور سے شور ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سیڑھیاں ختم
ہو چکی تھیں۔ پیانو بھی اب غائب ہو چکا تھا۔ سگریٹ کا دھواں بھی غائب ہو چکا تھا۔
اور وہ اب ایک روشن سی جگہ پر تھی۔ ٹانگیں تو اٹھائی بھی نہیں جاتی تھیں۔ جلن سی
ہو رہی تھی۔ اور بدن جیسے تھا ہی نہیں۔ وہ اپنے آپ کو بڑا ہلکا سا محسوس کر رہی تھی۔
اس کے ہاتھ پاؤں میں ایک قسم کی اینٹھن سی ہونے لگی۔ جیسے ساری طاقت کوئی کھینچ
رہا ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ آسمان پر سیاہی پھیل گئی تھی جیسے
بہت سے سگریٹ پی پی کر پیچ دار دھواں کوئی سارے آسمان پر چھوڑتا جا رہا
ہو۔ آہ وہ کروٹ لینا چاہتی تھی مگر سانولے سے ہاتھ اس کی کمر پر پھرنے لگے۔ نہیں
لوئس ڈارلنگ نہیں بڑی سخت چوٹ آئی ہے کروٹ نہ لو۔ وہ آواز سے چونک پڑی
تیز تیز گرم سانس اس کے ماتھے سے ٹکرا رہے تھے۔ اور لمبی لمبی کمزور سی انگلیاں کانپتی
ہوئی خوبصورت سی انگلیاں اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے چہرہ پر تیر رہی تھیں۔ سنہری
بال سفید سی پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور بھوری بھوری سی نشیلی نگاہوں میں
آنسو تیر رہے تھے۔ اس کی ٹانگوں کے پاس مٹیالے رنگ کی ساڑھی میں ملبوس

گورے گورے رنگ کا ایک جسم جو سر جھکائے۔اس کی سانولی سانولی پنڈلیوں کو کسی
چیز سے کس کر باندھنے میں مشغول تھا۔بھوری بھوری آنکھوں سے اب بڑے
بڑے آنسو گرتے ہوئے اس کی خون سے بھری ہوئی پیشانی دھو رہے تھے، گیلے
گیلے ہونٹ نہ جانے اب خشک کیوں ہو گئے تھے۔کانپتے ہوئے لبوں سے نکلتی ہوئی
آواز نکلی لوئس مجھے معاف کر دو میں نے کئی بار ہارن دیئے۔اور سپیڈ کم کرتے کرتے
بھی تم جھپٹے میں آ گئیں میری معصوم لوئس۔مجھے معاف کر دو میں بے قصور ہوں۔
سانولے ہاتھ آپس میں جڑ گئے۔لمبی لمبی کمزور سی انگلیاں آپس میں لپٹ گئیں۔اس
کا سر اس کے چہرہ پر جھک گیا۔اس کے براؤن کوٹ میں لگا ہوا سرخ گلاب کا پھول
اس کے آہستہ آہستہ دھڑکتے ہوئے دل کے پاس آ گرا۔ مٹیالی ساڑھی کے جسم میں
حرکت پیدا ہوئی سیاہ جوڑے میں لگے ہوئے سفید گلاب کے پھول قہقہے لگا رہے تھے
اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔اس کے جبڑے خود بخود بھینچنے لگے ۔اس کو
ایسا معلوم ہوا کہ اس کے سارے جسم کی طاقت مٹیالی سی ساڑھی میں جیسے کھنچی
چلی جا رہی تھی۔اور اس کے چاروں طرف اودا اودا سیاہ مٹیالا سا سگریٹ کا دھواں
گول گول لچھوں کی صورت میں تیرنے لگا۔اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سگریٹ
کے نرم نرم سیڑھیوں پر سے اترتی چلی جا رہی تھی۔بغیر کسی سہارے کے ایکدم ہی
اس نے اندھیرے میں لمبی لمبی کمزور سی انگلیوں کو زور سے پکڑ کر مروڑ دیا۔نرم نرم لچکدار
سی ہڈیاں اور تو کچھ بھی نہ تھا ان انگلیوں میں جن کے چھونے کی تمنا وہ اپنی زندگی میں

چھپائے رہی۔ مگر آج جب وہ ان کانپتی ہوئی انگلیوں کو پکڑ کر مڑ چکی، تو اس کے چہرہ پر اُداسی سی پھیل گئی۔ زرد سے چہرہ پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس کی روح سگریٹ کے سرمئی پیچ دار دھوئیں میں نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ بالکل اس طرح جیسے ایک کش لینے کے بعد۔ دھواں پچھے دار دائرے بناتا ہوا نہ جانے کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ سڑک کے چاروں طرف۔ آدمیوں کے سر ہی سر نظر آتے تھے۔ اور ان سروں کے بیچ میں سے کالی سی کار بالکل ایسی لگ رہی تھی جیسے کسی کی لاش کا بکس رکھا ہو۔ مجمع تتر بتر ہونے لگا۔ اور کالی کار مٹیالی ساڑھی والے جسم کو۔ بھورے کوٹ کو اور سانولے سے مردہ جسم کو لے کر مٹیالے دھوئیں میں غائب ہو گئی۔ سڑک پر خون بہہ رہا تھا۔ اور فٹ پاتھ کے پاس ایک پیر کا سینڈل خون میں لتھڑا ہوا پڑا تھا۔ کپڑے کا سینڈل۔ بوٹ پالش۔ سنسان سی سڑک پڑی تھی صاحب زادے لرزتی ہوئی آواز سے۔ آواز لگانے لگے۔ بڑے صاحبزادے نے حیرت سے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ابے یار ابھی تو یہ میم صاحب اس موڑ پر ملی تھی۔ اور میرے گانے پر کیسے گھور کر دیکھا تھا۔ بکھیا کیسے دم نکلا ہے خدا غریب کی بڑی جلدی سنتا ہے۔ اور مسکرا کر بیڑی کا ٹکڑا سلگانے لگا۔ اور چھوٹے چھوٹے پچھے دار۔ پہلے سے بدبودار دھوئیں چھوڑتے ہوئے یونہی سا گنگنانے لگا۔ سانجھ کی بیلا ——پنچھی اکیلا —— ساری سڑک پہ ایک قسم کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ آسمان سے زمین تک مٹیالا سا دھواں ہی دھواں تھا ——

آگ جل رہی تھی

۹/۱۰۰

اور اس کے ساتھ میں سمجھتا ہوں کہ دل بھی
جل رہا تھا

۱۹۷۲

پرور، او پرور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پرور کی بچی کہاں ہے بھئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اللہ میں نے جھلا کر رخسانہ کو چپکے سے کوسنا شروع کیا ——— کمبخت میرے پیچھے ہی لگی رہتی ہے ——— مگر میں بھی تو اسی اندھیرے میں کھڑی ہوں اُف اللہ کس قدر سردی ہے۔ میرے ہاتھوں میں فرائی پان کانپنے لگا۔ شاید سردی سے یا ڈر سے۔ مگر ڈر کس بات کا۔ میں نے کوئی گناہ تو نہیں کیا ——— نہ ہی ۔ ۔ ۔ میرے خیال میں عزت میں بٹہ لگنے والی کوئی بات ہے ——— پھر مجھے الجھن سی ہونے لگی۔

آخر کوئی بات بھی ہے۔ ہنسی گھٹی رخسانہ کی۔ برابر والی خانہ میں پپیتوں کے پیڑوں کے جھنڈ میں کھڑی پکار رہے جا رہی ہے۔ اونہہ بکے جا کے میری بلا سے

یہ بات بھی تو ہے۔ دوسروں کی باتیں چھپ چھپ کر سننا بری بات ہے۔ یہ تو معلوم ہے۔ مگر پھر بھی ایک عجیب سی خواہش تھی جو کروٹیں بدل رہی تھی۔ اکسا رہی تھی کہ ان غریب نیچے طبقے کے لوگوں کی اندرونی دنیا کیسی ہوتی ہے۔ آپس میں ان کی محبت کی کتنی مقدار ہے۔ کیا ان کی محبت کے شوالے بھی کھوکھلے ہوتے ہیں۔ ذرا طوفان آیا اور ڈھے گئے اور پھر تو ایسے نیست و نابود ہو جائیں جیسے یہاں عمارت تھی ہی نہیں۔ کسی کے خونِ آرزو میں گوندھی ہوئی نیو پڑی ہی نہیں تھی — ذرا دقت پڑا اور صفاچٹ میدان۔ اتنی اونچی اونچی رنگین عمارتیں۔ کہ پہلی آزمائش ہی میں ——— اڑاڑا دھم جب آنکھ کھلے تو اپنے چاروں طرف گرد و غبار سی گرد و غبار۔ ایسا گرد و غبار ——— جس میں ٹٹولتے ہی رہ جاؤ۔ مگر راستہ نہ ملے۔ مجھے بے حد سردی لگنے لگی۔ فرائی پان میں اب انڈے کی زردی زور زور سے سفید لیس دار پانی میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ ارے امی جان نے مجھے کب کا بھیجا تھا کہ ان انڈوں کا آملیٹ بنا لاؤ ——— آج وہ پھر خدائی مارے آپا جان کے لگتے سگتے آدھمکے۔ کمبخت ہتیا ہم پر پڑتی ہے۔

باورچی خانے میں منو کی ماں پھر زور سے ہنسی۔ میرا دل دھڑکنے لگا ——— چھوٹی سی اینٹ پر میں نے ڈرتے ڈرتے اچک کر دیکھا۔ اینٹوں کی جالیوں میں سے۔

آگ خوب تیز جل رہی تھی۔ دھڑا دھڑ لکڑیاں جل رہی تھیں کچھ چھوٹی

چھوٹی چھپتیاں چرچرائیں اور بھڑک کر دھیمے دھیمے جلنے لگیں۔

چولہے کے سامنے منو کی ماں ململی سی چادر اوڑھے۔ آہستہ آہستہ بے انتہا ہنس رہی تھی۔ سانولا رنگ اب بے حد سرخ ہو گیا تھا ـــــ ـــــ چھوٹی چھوٹی سی چندھی سی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میلا سا پانی۔ میراجی مُلّانے لگا ـــــ اسی کی آنکھیں ہیں کہ ہر وقت چپچپاتی رہتی ہیں۔ جب دیکھو آنسوں سے رستے رہتے ہیں ـــــ اور پھر ـــــ وہ لمبی ڈاڑھی والا خانساماں جو خیر سے بہرا بھی ہے۔ مگر اس وقت اپنی چندھی بیوی کی آہستہ آہستہ باتیں کیسے مسکرا مسکرا کر سن رہا تھا۔ پھر بھی کیسی پرسکون ہے ان کی محبت۔ یہاں اتی جان اور بابا جان کے تو نرالے ہی ڈھنگ ہیں۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ جب آپا بن ٹھن کر جانے کے لئے موٹر مانگنے بابا جان کے کمرے میں کیسے معصومانہ انداز سے داخل ہوتی ہیں۔ گھبرائی گھبرائی سی آنکھیں بنانی خوب آتی ہیں ـــــ حیران سی مسکراہٹ لئے ـــــ بابا جان مجھے آج موٹر چاہیئے۔ فلاں جگہ ٹینگ ہے۔ فلاں جگہ مشاعرہ ہے۔ آج کالج میں ڈبیٹ ہے۔ میں دیر سے آؤں گی ...... ـــــ موٹر چاہیئے ـــــ گڑگڑائے رسلے اس وقت کتنی معصوم سی لگتی ہیں جیسے ڈرتے ڈرتے کسی بہت ہی اہم کام کو انجام دینا ہے۔ اور جس میں باپ کی اجازت ضروری ہو ـــــ کیسی دغا باز ہیں اور جواب کے انتظار میں ساڑھی کے پلو کو انگلیوں سے

کیسے زور زور سے پیٹتی ہیں جیسے ابھی پہاڑ ہی توڑ ڈالیں گی۔ اس وقت ابا جان مسکرا کر اتی جان کو نظروں ہی نظروں میں نہ جانے کیا کہہ جاتے تھے ——— اور امی جان مسکرا کر ——— محبت سے آپا جان کی دل ہی دل میں بلائیں لیتی ہوں گی ———

اس وقت میں اور رخسانہ پردے کے پیچھے جل ہی تو جاتے تھے ——— جیسے پھڑ پھڑ کرتی ہوئی چھپکلیاں ہمارے سینے کے اندر جل رہی ہوں اور پھر دھبے دھبے جلنے لگتیں ——— ———

خانساماں نے ایک بڑی سی لکڑی اور چولہے میں سرکا دی۔ آج منو کی ماں کتنی سردی ہے۔ ابھی آٹا گوندھنا ہے ——— خانساماں نے مسکرا کر فلمی انداز میں منو کی ماں کی طرف دیکھا ———

ہاں ہیں گوندھے لیتی ہوں۔ بیوقوف خانساماں کے دھوکے میں آ گئی ——— یہ مرد ——— ہر جگہ اپنی ہیکڑی جتاتے ہیں۔ بھلا کوئی پوچھے تو کر تم ہو ——— نام ہے میاں کمانا ہے ——— خانساماں گیری کرتا ہے۔ ایک وہ ہیں' ٹھیٹوں مزے سے زندگی بسر کرتے ہیں مگر اس بہرے کو یہ خیال نہیں آیا کہ سردی ہے اور وہ بھی انسان ہے کیا آٹا گوندھتے ہوئے اسے سردی نہ لگے گی ——— سردی ——— مجھے بھی تو نہ جانے کتنی دیر سے لگ رہی تھی ——— مگر ——— کیا احمق پن ہے کہ باہر چپکی کھڑی ان کی باتیں سن رہی ہوں۔ ادھر آملیٹ بھی تیار کرنا ہے ——— رخسانہ بھی اب شاید اندر بھاگ گئی اندھیرے باغ میں

ڈر گئی ہو گی اور پھر شاید سوئی بھی لگ رہی ہو گی ——— اتنے مہینے چشمہ میں
بھی سرد سرد بگولے کلیجے میں کیسے لگتے ہیں ——— اور یہ دونوں ہماری لکڑیاں
کیسے بے دردی سے جلا رہے ہیں۔ کل ہی تو بابا جان نے نرسری سے کیکر کی سوکھی
ہوئی پتلی لکڑیوں کا گٹھا بھیجا تھا ——— اور یہ ان نازک سوکھی
ہری ٹہنیوں کو کیسے جلا رہے ہیں۔ چرچر - - - - - - چرچراتی ہوئی سلگ
رہی ہیں ——— سنا ہے ——— سوکھی کھوکھلی لکڑی میں آگ
بڑی جلدی لگتی ہے ——— اور جب لگ جاتی ہے تو بجھتی بھی بڑی
مشکل سے ہے ——— وہ بھڑکنا جانتی ہے ——— سلگنا نہیں ———
اور گیلی لکڑیاں چاہے کتنا ہی جلاؤ سلگتی رہتی ہیں۔ بھڑ بھڑا کر نہیں جلتیں۔ ———
جیسے آپا جان۔ سوکھی لکڑی کیکر کی نازک سی ساور بڑھ بڑھ کر شاید کھوکھلی بھی ہو گئی ہوں
——— ذرا سی گرمی پہنچی اور - - - - - - رخسار سرخ انگارہ سے ہونٹ
جلتی ہوئی آنکھیں ——— پھر کہاں آپا جان، لگیں بھڑ بھڑ جلنے ——— چرچراتی
تک نہیں ——— اسی پہ ماں باپ ہیں نہال نہال۔ اُف۔ نہ جانے آپا جان
کو دیکھ کر مجھے کیوں جلن سی ہونے لگتی ہے۔ جیسے آگ سلگنے لگتی ہو - - -
دھیمی دھیمی۔ جس کا دھواں دم گھونٹے دیتا ہو - - - - چرچر - - - -
روشنی اور بھی تیز ہو جاتی۔ چولھے کی کچی دیوار پر آگ کی روشنی سے خانساماں اور
خانساماں کے سائے اور بھی بڑے بڑے ہو جاتے۔ منہ چڑاتے ہوئے میلی کچیلی

دیوار پر سنہری سی روشنی پھیل جاتی۔ جس میں مکڑی کے جالوں میں چھوٹے چھوٹے مکڑیوں کے بچے بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ آگ کی گرمی سے ـــــ ورنہ شاید باریک سے جال میں انہیں سردی سے نیند بھی نہ آتی . . . . . .

منو کی ماں۔ میں نے گرم پانی کر دیا۔ ـ اب تو ذرا لگے ہاتھوں آٹا گوندھ۔ تو میں فدا بیڑی پی لوں ـــ ـــــ

میں نے پھر اچک کر اینٹ کے چھوٹے سے ٹکڑے پر سے دیکھا ـــ چندھی سی آنکھیں . . . . مسکرا رہی تھیں۔ ارے منو کے باپ تم نے کیوں گرم پانی کیا۔ کیا میں نے سردی میں کبھی کام نہیں کیا وہ مسکرا رہی تھی اس کا چہرہ اور بھی سرخ ہو گیا تھا۔ پانی آنکھوں سے اور بھی رسنے لگا۔ جیسے اب آٹے میں ٹپک ہی تو پڑے گا۔

اوہ۔ میں جھلا اٹھی۔ کمبخت کتنی گندی ہے۔ اس رسنے ہوئے پانی سے گندھے ہوئے آٹے کی ہم لعذ روٹی کھاتے ہیں۔ توبہ۔ میرا جی متلانے لگا۔ اب تو اندر جانا ہی پڑے گا۔

میں نے چپلوں کو زور زور سے مارتے ہوئے زمین پر چلنا شروع کیا۔۔
ـــــ ـــــ ارے آج پرور بی بی کیسے آگئیں؟ اور پھر اس سردی میں! خانسامن نے اپنی آنکھوں سے رستے ہوئے پانی کو میلی چادر سے پونچھتے ہوئے خوشامدی لہجہ میں کہا ہے۔۔

ارے آپ نے منّو کی ماں کو آواز دے لی ہوتی اوپر سے۔ آخر یہ کس لئے ہے۔ اور وہ لطیف کہاں مرگیا —— خانساماں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا ——

وہ موٹر صاف کررہا ہے۔ جلدی سے آملیٹ تیار کرواؤ اور کھانا بھی بیگم صاحبہ کہیں باہر جانے والی ہیں۔ کھانا جلدی چاہیئے۔ میرے ہاتھ اب ہلکے ہو چکے تھے۔ بھاری سا فرائی پان اب تیز تیز بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹوں میں گھرا ہوا تھا۔ جلتے ہوئے گھی میں انڈے کی زردی اور سفیدی اور گلابی گلابی پیاز کیسی شور مچا رہی تھی۔ چھُن چھُن، چھُن چھُن جیسے رات کے گیارہ بجے جاڑے کی خاموش راتوں میں جب گھر بھر بے خبر سوجاتا ہے اور اندھیرے کمرے میں چپکے سے ریڈیو کھول دیا جائے۔ اور اس وقت قسمت کی خوش نصیبی سے مدراسی آرکسٹرا بج رہا ہو۔ اور سب کی نیند کا خیال کرتے ہوئے والیئم بہت ہی کم کردیں۔ اس وقت بالکل ایسی آوازیں بھنچی بھنچی سی آتی ہیں جیسے اس وقت فرائی پان میں سے آرہی تھیں —— انڈے کی زردی اب گول دائرے میں پھیل گئی تھی۔ جیسے چھوٹی سی ٹکیا —— جس کے کناروں پر سفید لیس دار سا پانی پھول پھول کر پوڈر کی صورت میں جم گیا تھا —— میں نے جھک کر کیکر کی ایک سوکھی ہوئی نازک سی ٹہنی چولھے میں جھونک دی —— چڑ چڑ —— ایک چھوٹی سی سوکھی ہوئی شاخ جَھنّی۔ اور

بھڑ بھڑا کرتی ہوئی خوب تیزی سے ٹہنیاں جلنے لگیں ——— جیسے آپا جلی ہی جا رہی ہوں ——— مجھے خوشی سی ہوئی جیسے سلگتی ہوئی لکڑیوں پہ کسی نے پانی ڈال دیا ہو۔ مگر اُف یہ کڑوا کڑوا دھواں دھیما دھیما ...... جیسے سانس سا گھٹ رہا ہو ———

پھر .... پھر .... جلدی آملیٹ لاؤ ....

کتنی دیر لگا دی .... آپا سیڑھیوں پر کھڑی ...... چیخ رہی تھیں ...... اونھ .... میں پھر سلگنے لگی ——— بڑی نواب زادی ہیں نا جو حکم چلا رہی ہیں۔ ہم ہی نوکر رہ گئے ہیں جو اس سردی میں مریں آکر ——— اور وہ رخسانہ بھی مزے سے آتش دان کے پاس گرمی میں بیٹھی پڑھ رہی ہوگی ——— میرا بھی تو ٹیسٹ ہے ...... مجھے ہوش آیا ——— کتنی دیر ہو رہی ہے ——— کل کیا خاک لکھوں گی جا کر وہاں ... بھاڑ میں جائے سب کچھ ...... منو کی ماں تم دے جاؤ! اور کھانا بھی جلدی دے ——— چولہے میں بڑی تیز آگ جل رہی تھی ——— اور اب مجھے اس اندھیرے میں سردی میں ابھی اوپر جانا ہے ——— میں نے چیسٹر کو خوب لپیٹ لیا ——— اور تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ کتنی جلدی چڑھ گئی تھی ... ——— کمرے میں پردوں کے پیچھے کوئی سسکیاں لے رہا تھا ——— اندھیرے میں پردے کے پیچھے ...... گرم گرم ——

میں ڈر گئی ـــــ کون! رخسانہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے تم یہاں کیوں چھپی
رو رہی ہو ـــــ

خاموش ـــــ اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ اور کان کے پاس
منہ لاتے ہی ان پر دوبارہ رقت طاری ہو گئی ـــــ

ارے کچھ کہو گی بھی۔ میں پھر سلگنے لگی ـــــ آپا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپا
نے مجھے آج پھر ڈانٹا ـــــ پرویز بھیا کو ایک منٹ اکیلے نہیں چھوڑتیں
جب وہ یہاں آ جاتے ہیں تو ـــــ کالج میں تو نہ جانے کیا حال ہو گا کتابوں
کی طرح بغل میں دبائے پھرتی ہوں گی ـــــ کہ کہیں ان کے شربتی
آنکھوں والے کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی ان ہی جیسی بے صبری اچکا نہ لے اونھ
وہ غریب تو نھنے سے دودھ پیتے بچے ہیں نا ـــــ اتنی بھی کیا محبت ۔ ۔ ۔
جو ٹپکی ہی پڑتی ہے۔ اور کوئی تو جیسے بھوکا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اونھ اتراتی کس
قدر ہیں۔ ابھی تو خیر سے شادی بھی نہیں ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
وہ۔ پرویز کیسے۔ آپا کے سامنے آتے ہی کیسے بھیگی بلی بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ نگاہیں تک
نہیں اٹھاتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ جانتے ہی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔
جہاں اوجھل ہوئیں اور جیسے کینچلی بدل ڈالی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رخسانہ تم خاموش
کیوں ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا خفا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہارے بال کتنے سنہری
اور ملائم ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر میرے بالوں میں اپنی لرزتی ہوئی انگلیاں کس

بے تکلفی سے پھرنے لگتے ہیں .... جیسے ان کا واسطہ اب شاید آپا سے پڑے گا ہی نہیں .... مگر آپا کی پرچھائیں نظر آئی اور کیسے بدل گئے جیسے یہ ہمیں جانتے ہی نہیں .... نہ جانے کیا عادت ہے .... اف اللہ ....

وہ بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کے تھمے ہوئے آنسو رخساروں پر بہنے لگے۔ میں حیران تھی کہ آخر آج یہ کیا بک رہی ہے۔ اس کے ہاتھ اور چہرہ کتنا گرم ہو گیا تھا۔ مجھے ڈر لگا شاید بخار ہو گیا ہے ——— آخر تم کب تک اس پردے کے پیچھے کھڑی رہو گی۔ میں نے جل کر کہا۔ تم کو بہت تیز بخار ہو گیا ہے۔ شاید سردی لگ کر اور غصے سے بھی ———

عصمہ! وہ حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں سے مجھے آگ کی گرمی محسوس ہوئی۔ چمکدار تیز آگ کی روشنی۔ جیسے باریک سیاہ پردوں کے نیچے آگ کے شعلے دہک رہے تھے۔ سچ مچ سلگ رہی تھی بیچاری مجھے رحم آ گیا ——— ساتھ ہی مجھے اپنا بھی خیال آیا ——— مجھے بھی تو نوکر سمجھا تھا۔ اتنی سردی میں نیچے خانساماں کے پاس بھیجا۔ پرویز کے بچے کے لئے آملیٹ بنوا لاؤ۔ جب تک ان کے حلق سے دو تین سالن نہ اتریں کھانا تھوڑی کھا سکتے ہیں۔ نواب زادے .... ہم دونوں اپنے کمرے میں لیمپ کی روشنی میں سلگ رہے تھے۔ سردی میں ———

امی جان، بابا جان سینما نائٹ شو گئے ہوئے تھے ——— اتنے بڑے گھر میں ہم دونوں اکیلے کمرے میں سلگتی ہوئی آگ آنسوؤں سے بجھا رہے تھے۔ آتشدان پر آپا جان اور پرویز بھیا نے قبضہ کر رکھا تھا۔ اب میں سمجھی رخسانہ۔ میں نے جلتے ہوئے کہا۔ تم کو کیوں اٹھایا تھا وہاں سے۔ کیونکہ ان کو بھی سردی لگ رہی تھی اور تم کو وہ اٹھانا چاہتے تھے سمجھیں....

رخسانہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ڈرائنگ روم سے آپا کی دبی دبی ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا ——— شاید رخسانہ کا بھی دھڑک رہا ہوگا۔ مگر چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں نے اشارہ سے کہا۔ چل دیکھیں۔ اس نے سر ہلا دیا نہیں ——— اوہو ——— جب سے تو جناب چھپی کھڑی تھیں پردے کے پیچھے اور اب میں نے جب کہا تو ——— نخرہ۔ جاؤ.......

میں نے چپکے سے پردے میں سے جھانکا۔ آتشدان میں خوب تیزی سے سوکھی ہوئی کیکر کی لکڑیاں جل رہی تھیں ——— بھڑ بھڑ ——— آپا نیلی شال اوڑھے چمک رہی تھیں۔ سرخ رخسارے۔ انگارہ سے کانپتے ہوئے ہونٹ۔ جلتی ہوئی آنکھیں۔ اور یہ کمبخت پرویز بھیا۔ کس غضب کے خوبصورت لگ رہے تھے۔ نیلے سوٹ میں سرخ چہرہ ——— آگ کی روشنی میں کیسا سرخ ہو گیا تھا ——— بھوری بھوری آنکھیں۔ جیسے اب رو دی

دیں گے۔ ابھی تو خاصے ہنس رہے تھے دونو ——— مگر اب کیا ہو گیا جیسے
اب دونوں چیخیں مار کر رونیں گے۔ مجھے ڈر لگنے لگا . . . . . . اکیلے ٹھیک
نہیں۔ میں آہستہ سے رخسانہ کے پاس آئی۔ کیسی بے خبر کرسی پر ٹانگیں چڑھائے
کہنیاں میز پر ٹیکے کتنے غور سے جلتے ہوئے لیمپ کو دیکھ رہی تھی۔ رخسانہ رخسانہ
. . . . . . وہ چونک پڑی۔ کیا ہے وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ خالی
خالی نظریں ——— حیران گھبرایا ہوا معصوم سا چہرہ ——— میں ہنس
پڑی۔ پگلی کیا ہوا تجھے ——— ؟

"کچھ بھی نہیں" وہ اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے بولی۔

تو چلو آپا کو دیکھو۔ کیسے بیٹھی ہیں۔ نیلی نیلی شال میں سفید سا ماتھا سرخ سے رخسار، عنابی ہونٹ، کالی کالی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں۔ سیاہ چمکدار بال۔ کیسے کمر پر بکھرے ہوئے ہیں۔ اور دیکھنا رخسانہ میں سردی سے مجبور ہو کر اس کی کرسی میں ٹھس گئی۔

دیکھنا رخسانہ پرویز بھیا بھی آج کتنے خوبصورت معلوم ہو رہے ہیں کہ . .
میں کیا بتاؤں۔ میں نے حلق کا پانی نگلا۔ ان دونوں کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔
جب دیکھو ایک رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔ رخسانہ تعجب سے بولی ———
اس میں کیا بات ہے۔ ایک روز پہلے کہہ جاتے ہوں گے ———

ہوں . . . . . . وہ پھر خاموش نظروں سے جلتے ہوئے لیمپ

کو گھورنے لگی ——— اوہو . . . . . . یہ اتنی لمبی۔ ہوں کس سلسلہ میں۔ میں نے منہ چڑاتے ہوئے رخسانہ کو دیکھا۔ مگر وہاں صرف سنجیدہ مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ تو بہ میرا دل گھبرانے لگا۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ جو ہے وہ روئے دیتا ہے ——— منحوس شکلیں۔ چلو آپا اور پرویز بھائی کو دیکھیں ———

اونھ کیا دیکھیں . . . . وہ جھلائی . . . . بہت دیکھ لیا۔ پرویز بھیا . . . . . . آپا کو بھی بہت کچھ دیکھ لیا پرویز بھیا ——— کی سفید سفید انگلیاں ——— آپا کے سیاہ چمکدار بال کمر پہ بکھرے ہوئے ——— وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ جیسے نیند میں بڑبڑا رہی تھی۔ حیران نظریں جلتے ہوئے لیمپ پر جمی ہوئی تھیں۔ پتھرائی سی میں حیران سی کھڑی تھی۔ شاید اسے معلوم نہ تھا کہ میں اس کے پاس کھڑی ہوں وہ پھر بڑبڑائی۔ ارے آپا کی طرح یہ بھی . . . . . . سوکھی کھوکھلی کیکر کی ٹہنی ہے۔ وہ چڑچڑائی۔ اور رخسار سرخ ہو گئے۔ ہونٹ انگارہ سے ہو گئے جلتی ہوئی آنکھوں سے پانی رسنے لگا۔ موٹے موٹے آنسو جلتے ہوئے . . . . . . نہ جانے کیوں۔ میں بھاگی ہوئی پردے کے پیچھے گئی۔ مگر آتشدان کے پاس اب کوئی بھی نہ تھا پرویز بھیا چلے گئے تھے آگ مدھم پڑ گئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ آتشدان کے پاس پہنچ گئی۔ آپا کے کمرے کی بتی جل رہی تھی اور دروازے بند تھے۔ آپا کے کھانسنے کی آواز آہستہ آہستہ دروازوں سے ٹکرا رہی تھی ——— مجھے سردی پھر زور سے لگی۔ میں اکیلی آتشدان کے پاس بیٹھ گئی۔ سوکھی ہوئی کیکر

کی ٹہنیاں آگ میں سرکا دیں۔ بھڑ بھڑ ۔۔۔ ۔۔۔۔۔ وہ پھڑکنے لگیں۔ چھوٹی
چھوٹی ٹہنیاں چرچرائیں۔ اور پھر خوب تیزی سے آگ جل رہی تھی ۔۔۔۔۔۔۔
چرچر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

100/1

کس قدر رنگین ہے راہِ محبت کا فریب

صرف محبت کے فریب پیدا ترہب اتنا قدر ہیں

تم نہ معلوم ہوئے عاشق نامراد نے سمجھا تو کیا

سیر تماشا کر نے ———————— ؟

"قلی یہ سامان اتارو"

وہ حیران سی کھڑی تھی۔ لاہور کے خوبصورت اور زندگی سے لبریز
اسٹیشن پر ٹہلتے ہوئے بے فکر چہرے اس کی ہوا سے لہراتی ہوئی سیاہ
نقاب میں سے جانے کیا چیز ڈھونڈھنا چاہتے تھے۔ قلی اب سارا
سامان پلیٹ فارم پر رکھ چکا تھا۔ اس کا دل نہ جانے کیوں دھڑکنے لگا
ہائے خالہ جان کو شائد میرا تار نہیں ملا۔ اور آج کل تو راحیل بھیا کی
بھی چھٹیاں ہیں...... راحیل .... بھیا... وہ یونہی
کچھ جھینپ سی گئی۔ میں بھلا بھیا کیوں کہوں۔ کتنا چڑتے ہیں بھیا کہنے
سے۔ اتنا نہیں سمجھتے ہیں کوئی سچے دل سے بھیا تھوڑا ہی کہتی ہوں سفید

سفید سرخی مائل مسکراتے ہوئے تین چہرے اس کے بالکل قریب
سے نکلے اتنے قریب کہ ان کے کپڑوں کی سرسراہٹ کو اس کے
دھڑکتے ہوئے دل نے بھی محسوس کیا بھینی بھینی سینٹ کی خوشبو
سیاہ چمکدار شریری سی ناچتی ہوئی آنکھیں ——— شربتی سنہری چمکدار
سی آنکھیں ——— بھوری بھوری سی' اس نے اپنے سیاہ برقع
کی باریک جالی میں سے کتنے قریب سے دیکھا تھا۔ کتنی خوبصورت
آنکھیں تھیں۔ کس قدر دلکش' جیسے کسی اطالوی مصور کے شاہکار کی
آنکھیں۔ جیسے کسی نے ملائم بھورے چمکدار ریشم کو موتیوں کی آب میں
بھگو دیا ہو۔ ——— ہائے اللہ کتنی خوبصورت آنکھیں تھیں ———
اونھ ——— وہ پھر گھبرانے لگی ——— آخر خالہ جان نے کسی
کو بھی لینے نہیں بھیجا ——— کیوں؟ کیا میرا تار نہیں ملا ——— ؟
گھڑی دیکھی۔ نو بج کر کچھ منٹ ہوئے تھے ——— آج تو گاڑی
بھی لیٹ نہیں آئی۔ اس نے سوچا۔ جو کوئی انتظار کر کے جا چکا ہو ———
وہ گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

قلی سامان اٹھا لو ——— ہلو ——— ہلو صبیحی ——— وہ
صرف برقع میں مسکرا دی الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔
نہ جانے کیوں دل اور بھی زور سے دھڑکنے لگا۔

ٹن ٹن ٹن ——— اس نے گننا شروع کیا۔ بارہ بج گئے اور پھر گرمیوں کی تاروں بھری راتیں۔ جو بہت سے پارساؤں کو آزما چکی ہوں ——— پھر ان غریب ناسمجھ لڑکیوں کو تڑپا دینا تو ان شریر ستاروں کا محبوب مشغلہ ہے ——— اور وہ چمکتا ہوا گول مول سا ٹھنڈا ٹھنڈا چاند جو کتنی ہی جلتی ہوئی آنکھوں کو کم سے کم تھوڑی دیر کے لئے ٹھنڈک پہنچا دیتا ہے۔ لیکن آنکھوں کو جہاں چاند کی ٹھنڈک نصیب ہوئی نہ جانے اس کی آنکھوں کی نیند کون اڑا کر لے گیا تھا کروٹیں بدلتے بدلتے اس کا بدن دکھنے لگا تھا ——— اس کا دل بری طرح مچل رہا تھا۔ آج اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دنیا نے اب تک اسے بیوقوف بنایا ہے۔ صبح کے نو بجے سے رات کے بارہ بجے تک اس لمبے چوڑے گھر کے سبھی لوگوں نے تو اس سے جی بھر کے باتیں کر ڈالیں خالہ جان نے تو غضب خدا کا سر میں درد ہی کر کے چھوڑا، امی کے بارے میں سارے جہان کی باتیں پوچھ ڈالیں۔ مگر اس کے دل میں ایک ہلکی سی جستجو مچل رہی تھی۔ زمانہ کس طرح بدل جاتا ہے۔ راحیل ——— وہ راحیل جو دو دو گھنٹے اپنے کالج کی لڑکیوں کے بارے میں فضول فضول سے قصے سنایا کرتا تھا۔ جو کبھی باتیں کرتے تھکتا ہی نہیں تھا ——— اور وہ بھی ہمیشہ بڑی دلچسپی سے سنا کرتی تھی ——— اس کی نگاہیں کبھی کبھی

اس کی حیران نگاہوں سے الجھ کر رہ جاتیں۔ ہونٹ تھرتھرانے لگتے۔ اور
دل بے اختیار دھڑکنے لگتا ——— وہ کچھ جھینپ سی جاتی اور نظریں
نیچی کر کے پھر سننے لگتی۔ اس کی انگلیاں اس وقت کتنی کمزور سی ہو جاتیں
ذرا سی چمکدار بُننے کی سلائیاں بھی نہ سنبھال سکتیں۔ پھر بھی وہ چاہتی تھی
کہ وہ فضول سے قہقہے سناتے ہی رہ۔ جب تک کہ کھانے کا وقت نہ
آجائے۔ مگر آج صبح سے اس نے صرف تین فقرے ادا کئے۔ جو اب
تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ کتنی اکتاہٹ تھی اُن جملوں میں
ہلو صبیحی ——— صبیحی پیچھے بیٹھو ——— کچھ بھی نہیں بول تو رہا ہوں
.... اور پھر وہی حیران سی آنکھیں۔ مغرور سا چہرہ۔ اس وقت
اسے رونا سا آگیا تھا ——— جب وہ کار کے قریب آکر اگلی سیٹ
پر بیٹھنا چاہتی تھی۔ اسے اگلی سیٹ بہت پسند تھی خواہ اُسے ڈرائیور
کے پاس ہی بیٹھنا پڑے۔ اور جب بھائی جان ڈرائیو کرتے تھے تو
بھائی جان سے کتنی دفعہ اس کی لڑائی ہوتے ہوتے بچی تھی، مگر جیت
اسی کی ہوتی اور وہ اگلی سیٹ پر بیٹھتی۔ مگر راحیل نے کیسے تیز لہجہ میں
کہا تھا۔ صبیحی پیچھے بیٹھو ——— اور وہ شرمندہ سی ہو کر پیچھے نرم
نرم گدے پر گر پڑی تھی۔ موٹر سنسان سی سڑک پر کس تیزی سے
راستہ طے کر رہی تھی ——— راحیل ڈرائیو کر رہا تھا۔ سنسان

سی سڑک۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے۔ نرم نرم گدوں میں نڈھال سا دھنسا ہوا جسم ——— جو موٹر کی تیز رفتار سے کبھی کبھی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ خود ہی اچھل پڑتا۔ ایک لطیف سے ہچکولے کے ساتھ ——— راستے میں راحیل نے کوئی بھی بات نہیں کی ——— اس کے دل میں میٹھی میٹھی شکروں میں ڈوبی ہوئی جلن سے محسوس ہونے لگی۔ آنکھوں میں آنسو مچل کر رہ گئے۔ وہ پلنگ پر پڑی کروٹیں بدلتی رہی۔ اس کا جی چاہا کہ اس چاند کی پھیکی پھیکی زرد روشنی میں چپکے سے باغیچے کی طرف نکل جائے جھولتی ہوئی ننھی ننھی ٹہنیوں میں اپنی بانہیں لپیٹ دے۔ کھلے ہوئے چمپا کی بھینی بھینی خوشبو سے مست ہو جائے۔ اور اس ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں خود کو بہنے دے۔ نرم نرم کھلے ہوئے پھول کی کچھ سفید کچھ پیلی پیلی پتیاں۔ جیسے خوف سے سفید چہرہ زرد ہو گیا ہو۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس نرم نرم ٹھنڈی ٹھنڈی پتیوں کو اپنے گرم گرم رخساروں پر ہلکے ہلکے پھیرے۔ گرم گرم ہونٹوں میں پھول کی ٹھنڈی ٹھنڈی کھلی ہوئی پتیوں کو آہستہ آہستہ کھینچ کر توڑ ڈالے اور جب کھلی ہوئی پتی اس کے ہونٹوں پر چپک جائے تو وہ گرم گرم سانسوں کے ذریعہ اسے کمہلا دے اس کا میٹھا میٹھا ——— ایسا

میٹھا۔ جس میں کچھ تلخی بھی ہو رس چوس لے اور پھر اسے مروڑ کر دانتوں سے بالکل ہی مسل دے۔ کتنا مزا آتا تھا۔ اسے اس کھیل میں خواہ مخواہ اگر کچھ کام نہ ہو تو فضول گھومتے ہوئے کمرے میں خوبصورت گلدانوں کے کھلے ہوئے خوشبو دار پھولوں کی تو پھر خیر نہیں۔ اور گلاب کی نازک پنکھڑیاں تو حلق سے باہر آتی ہی نہیں۔ بکریوں کی طرح چبا جاتی تھی۔ مگر اس وقت نازک نازک خوشبو دار پھول کہاں ٹھنڈا سا لمبا چوڑا بستر کسا ہوا پلنگ اسے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ اس جگہ سے۔ وہ خود بھی حیران تھی۔

آج اس خوبصورت سی کوٹھی میں ساری دلچسپیوں کا سامان موجود ہے اور پھر راحیل کی قربت بھی حاصل ہے یہی نہیں بلکہ اس کا پلنگ اس کے پلنگ کے بالکل قریب ہی ہے۔ مگر پھر بھی وہ اس سے کوسوں دور ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک ایسا فاصلہ حائل تھا جسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں ـــــ ٹن ٹن ـــــ گھڑی نے دو بجائے اور وہ سوچنے لگی کہ آخر وہ کب تک یونہی جاگتی رہے گی۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ گرم گرم آنکھیں جن میں جلن سے ہو رہی تھی۔ ان میں اب چبھن سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اکتا کر پھیکے پھیکے زرد چاند کو دیکھنے لگی جس سے میں ٹھنڈی ٹھنڈی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اس کی جلتی ہوئی آنکھیں تھوڑی دیر کے لئے ٹھنڈک سی محسوس کرنے لگیں۔ رفتہ رفتہ اس کی

آنکھیں خود بخود بند ہوتے لگیں ـــــ ٹھنڈا ٹھنڈا سفید گداز سا تکیہ اس نے اپنے گرم گرم سرخ ہاتھوں میں مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ جیسے کسی معصوم بچے کو خطرے سے بچانے کے لئے ماں اپنے سینے سے چمٹا لے۔ چہرہ پر بے چینی اور پریشانی سی تھی۔ پیشانی پر ہزاروں بل سے پڑ گئے تھے۔ گلابی گلابی ہونٹ آپس میں ملے اور پھر الگ ہو گئے۔ آخر یہ بے رخی کیسی ـــــ اس کے ہاتھوں میں تکیہ دبا ہوا تھا۔ وہ پھر بڑبڑائی صبح سے اب تک آواز کو ترس گئی ـــــ تم کیوں ناراض ہو۔ راحیل خدا کے لئے جواب دو ـــــ وہ زور سے تکیہ کو جھنجوڑنے لگی۔ جواب دو راحیل کیا تم مجھ سے خفا ہو۔ آخر کیا وجہ ہوئی۔ کیا تم اپنے وعدوں کو بھول گئے۔ تم کتنے بدل گئے۔ تمہارے جملے ابھی تک مجھے یاد ہیں۔ جب تم ایم۔ اے کر کے لاہور جا رہے تھے۔ اور تم نے ـــــ بارش میں اندھیری سی شام میں بھیگے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ـــــ بجلی کیسی غضب کی چمک رہی تھی۔ اس طوفانی شام میں تم میرے پاس آئے تھے۔ تمہارے سیاہ ست بال جن پر پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ سفید چمکتی ہوئی پیشانی پر پریشان تھے۔ تمہارا چہرہ کتنا سرخ تھا۔ اس سردی میں تمہیں پسینہ آ رہا تھا اور تم نے کتنی عاجزی سے کہا تھا۔ صبیحی کل میں جا رہا ہوں۔ کیا تم خط لکھو گی ـــــ ؟ اور پھر ـــــ پھر تمہاری آنکھوں میں نہ جانے کیوں آنسو تڑپ رہے تھے

چمکیلا پانی پلکوں پر آکر ٹھہر گیا تھا ــــ تمہارے ہاتھ کانپ رہے تھے۔
تمہاری نگاہیں میرے پیروں پر جھکی ہوئی تھیں۔ تم کتنے گھبرائے ہوئے
سے تھے۔ معصوم سا چہرہ ــــ حیرت بھری سیاہ سی آنکھیں ــــ
تم نے رکتے ہوئے ــــ آہستہ سے کہا تھا۔ صبیحی تم مجھے بھول سکتی
ہو ــــ لیکن شاید میں تمہیں نہ بھول سکوں تمہارے ہونٹ کانپ
رہے تھے ــــ تمہاری کانپتی ہوئی سفید سی انگلیاں ٹیبل لیمپ کے
نازک سے پیازی شیڈ پر یونہی سی تھرتھرا رہی تھیں۔ تم کتنے بدحواس
تھے ــــ لیمپ کی تیز روشنی میں تمہاری۔ ۔ ۔ ۔ سیاہ چمکیلی بیقرار
نگاہیں سرخ پسینے سے تر چہرہ سرخ کانپتے ہوئے ہونٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم کتنے
بے چین تھے تم نے سر جھکائے ہوئے کہا تھا۔ صبیحی تم چاہے خط نہ لکھو مگر میں
ہمیشہ انتظار کروں گا۔ کیا تم لاہور نہیں آؤ گی۔ ۔ ۔ ۔ راحیل جواب دو۔ ۔ ۔
میں کتنے ارمان لے کر یہاں چھٹیاں گذارنے آئی۔ تم کس قدر بدل گئے راحیل
میں صرف تمہاری خاطر یہاں آئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ راحیل بولو ۔ ۔ ۔ ۔ جواب دو ۔ ۔ ۔ ۔

اس کی آواز آہستہ سے آہستہ تر ہوتی گئی۔ زرد پھیکے پھیکے چاند نے
اور بھی اُداس ہوکر سیاہ چادر سے اپنا منہ ڈھک لیا۔ ۔ ۔ ۔ ٹھنڈی ٹھنڈی
ہوائیں اس کے سیاہ بال اس کے رخساروں کو چوم رہے تھے اس کا چہرہ
سفید پڑ گیا تھا۔ بند آنکھوں کی پلکوں میں چمکتے ہوئے آنسوؤں کے قطرے چمک

رہے تھے۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔

سب ہی تو حیران تھے۔ آخر صبیحی پرسوں تو آئی اور آج ہی جا بھی رہی ہے کیوں؟ ۔ ۔ ۔ کس لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ خیر تو ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ جواب دیتے دیتے تھک گئی تھی۔ مگر وہ خود بھی معقول جواب نہ دے سکی کیوں آئی تھی۔ کیوں جا رہی ہے۔ کچھ بھی نہیں خالہ جان وہ اکتا کر کہتی ایسے ہی دل نہیں لگتا اور بچی ایسا بھی کیا دل۔ ابھی آئی کو کون سے دن گزرے جو جانا بھی ہو گیا ـــــ کم سے کم آٹھ دن تو ٹھہرتیں۔ ۔ ۔ ابھی کے دن کے رات ـــــ۔

نہیں خالہ جان میں اب نہیں ٹھہروں گی۔ وہ اکتا کر کہہ رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا رو دے خوب زور زور سے ـــــ کم بخت کپڑے ہی بکس میں نہیں آتے۔ وہ بیزار سی ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ صدی کو پکڑ کر خوب پیٹے ـــــ آخر اس نے کیا کیا مگر نہ جانے اسے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا ۔ ۔ ۔ جیسے جیسے ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی ساری کائنات جس کو اس نے چھپا چھپا کر اب تک اپنے دل کے گوشے میں رکھا اس کو صدی نوچ رہی ہے چپکے چپکے کھینچ رہی ہے اور اب عنقریب چھین لے گی۔ کوئی خاص بات بھی نہ تھی۔ گھر کی چھوکری سعیدہ آنکھوں والی سانولہ سا رنگ پھیکے

ہوئے میلے سے کپڑے ۔ ۔ ۔ مسکراتے ہوئے لب تھرتھراتے ہوئے مگر
چہرہ پر ایک قسم کا خوف سا —— ہر ہچکولے سے ڈر جانے والی مگر نہ جانے
اسے کیوں وہم سا ہو گیا تھا۔ مگر ہاں —— وہ اس چیز کو نوٹ کر رہی تھی
صبح چائے پر تو اس کا شک یقیں تک پہنچ گیا تھا —— جب راحیل
نے چیز کا ڈبہ الماری میں سے صدی سے نکلوایا تھا۔ اور دیتے وقت اس
کی لمبی لمبی پیلی سی کانپتی ہوئی انگلیاں سفید سفید سخت انگلیوں سے ٹکرا
گئی تھیں ——

سانولا چہرہ بوسیدہ میلی چادر میں سرخ پڑ گیا تھا۔ مسکراتے ہوئے
لبوں سے سفید دانت جھانک رہے تھے —— اور سرخ و سفید چہرہ
پسینہ میں تر ہو گیا تھا —— ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کا دل جیسے ڈوب
رہا تھا۔ چائے کی پیالی جیسے گرتی گرتی بچی —— اس کا جی چاہا کہ ——
ابھی سیدھی اُٹھ کر اسٹیشن چلی جائے مگر —— مجبور تھی۔ صدی صدی
گھر کی چھوکری ان پڑھ بیوقوف سی چھوکری۔ اس کی پوشیدہ محبت کو چھین
رہی ہے —— اسی محبت کو جو اس نے چھپا چھپا کر ہمیشہ۔ اپنے دل
میں رکھا وہ راحیل کو کس قدر چاہتی تھی۔ مگر کبھی اس نے راحیل پر ظاہر
ہی نہیں کیا ——

اپنی چیزیں جمع کرتے کرتے وہ تھک گئی تھی۔ کپڑوں کے ڈھیر

میں سے اس کو نرم گرم ساعنابی رنگ کا ملائم سیاہ سوئٹر نظر آیا — وہ کتنی جلدی بھول گئی تھی۔ کس شوق سے اس نے راحیل کے لئے سوئٹر بنا تھا — اور ساتھ لائی تھی کہ اسے دے گی اپنی نشانی۔ تاکہ دور رہ کر بھی وہ اسے نہ بھول سکے — مگر راحیل نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ اس سے تین روز میں صرف دو دفعہ بولا — کتنے اکتائے ہوئے جملے تھے ....
اس کے سینے میں ایک قسم کا درد سا ہونے لگا اور پلکوں میں سفید سفید آنسوؤں کے قطرے کانپ رہے تھے — وہ ایک دم مسکرا پڑی جانے سے پہلے ایک دفعہ پھر وہ راحیل سے مل لے شاید وہ روک لے۔ شاید وہ سوئٹر دیکھ کر خوش ہو جائے۔ وہ بھاگی ہوئی سوئٹر کو سینے سے چمٹائے ہوئے راحیل کے — کمرے میں آہستہ آہستہ داخل ہو گئی۔ پردا اٹھا کر وہ ٹھٹک گئی — نرم نرم صوفے پر بوسیدہ میلے کچیلے دوپٹہ میں لپٹا ہوا جسم سیاہ حیران سی نگاہیں سانولا سا چہرہ سرخ و سفید چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ سرخ چہرہ پسینہ میں تر تھا۔ سرخ ہونٹ کانپ رہے تھے ...
کھڑکی کے بند دروازے کے ایک سوراخ سے سورج کی ننھی ننھی شعاعوں میں دو چہرے چمک رہے تھے — صدی — اس کا حلق خشک ہونے لگا — ہاتھ پاؤں جیسے سن ہو گئے تھے۔ سینے سے چمٹا ہوا سوئٹر اس کے پیروں میں پڑا ہوا تھا۔

عنوان کیا ہے ایک لفظوں کی فوج ہے۔

جی ہاں جناب بجا فرمایا ہے آپ نے

کسی حرف کا ہزیمہ یافتہ ہیں!

نینن ہین کو راہ دکھاؤ

مس صاحبہ لعنت ہے تم پر۔ خواہ مخواہ میرا قیمتی وقت

اس فضولیات میں ضائع ہوا۔

نینا رے ــــــــ دیکھے ان کے نین ۔۔۔۔۔ تا ۔۔۔ ۔ لبھنت
ان میں بہاران ہیں، جیون کا رس سنگھار، دنیا بھر کا چین ۔۔۔۔ نیارے
دیکھے ان کے نینا ۔۔۔۔۔۔

خورشید کا یہ ریکارڈ نہ جانے کب سے صلّو بجا رہی تھی۔ نہ جانے
کیا جادو ہے اس آواز میں، بس اندھیرے ڈرائنگ روم میں صوفے
میں دھنسی پڑی تھی ۔۔۔۔۔۔ شام تاریک ہوتی جا رہی تھی ۔۔۔۔
آج نہ جانے شام کیوں اتنی اداس ہے۔ میں اتنی بیچین کیوں ہوں ــ
کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں یہی سوچ رہی تھی۔ آنکھیں روتے روتے
جلنے لگی تھیں ــــــــ نہ جانے کیوں، مرنے کو جی چاہ رہا تھا ــــ

مجھے کھانسی اٹھنے لگی۔ مگر دوپٹہ ٹھونس لیا۔ کیونکہ خالہ جان نے اگر
سن لیا کسی کمرے سے تو ڈانٹ پڑے گی۔ تم ابھی تک سیر کرنے
کیوں نہیں گئیں ـــــــ اونھ اب جب مجھے زندگی کی منزل بہت
جلدی ختم کرنی ہے۔ اس وقت سب کو فکر ہوا۔ اب سب کو ہمدردی
پیدا ہوئی۔ کہ دنیا کی سیر کئے بغیر نہ چلی جائے۔ دنیا کی سیر۔ جہاں ٹھنڈی
ٹھنڈی ہواؤں کے مدہوش سے جھونکے بے ہوش کر دیتے ہیں خوشنما
مہکتے پھول اپنی خوشبوؤں سے ہر ایک کو کھینچ کھینچ کر اپنے پاس بلاتے ہیں
جب پھول کوئی توڑنا چاہیں تو' نرم نرم خوشنما پتیوں کے نیچے نوکیلے کانٹے
ایسے چبھتے ہیں۔ جن کی کسک . . . عمر بھر رہتی ہے۔ اور آخری منزل پر
بھی کانٹے ہی الوداع کرتے ہیں۔

کانٹے ـــــــ اور انہی کانٹوں کی تعریف' ہے بسنت ان ہیں'
بہاران ہیں' دنیا بھر کا چین۔ خورشید گا رہی تھی۔ درد بھری آواز میں کانٹے
کی چبھن سے بے تاب ہو کر . . . . میری عزیز صلّو معصوم پیاری
سی بہن۔ مجھے ڈر ہے یہ کیوں اس ریکارڈ کو آج بجائے چلی جا رہی ہے
سوچتے ہی روح کانپ جاتی ہے۔ اور میری زندگی کو چھیدتا ہوا کانٹا
جو اب تھوڑے دنوں میں پار نکل جائے گا۔ پھر آج چبھنے لگا۔ کیسی
چبھن ہے' کہ آنسو تک ساتھ آجاتے ہیں۔ یہ قہقہے لگاتی ہوئی صلّو نے

بھی کہیں مہکتا ہوا پھول تو نہیں توڑ لیا ـــــــــ آخر یہ اس اُداس شام میں اپنے کمرے میں بیٹھی ۔ ۔ ۔ ۔ آج ریکارڈ بجائے جارہی ہے۔ بالکل میری طرح جنونی حالت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بھی کبھی قہقہہ لگانا جانتی تھی ۔میری زندگی میں بھی ایک چلبلا پن تھا۔ دنیا کی سیر کرنے کی کی خواہش ۔ایک نیا پن میں اپنی زندگی میں ہمیشہ محسوس کرتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اس سے پہلے جب میں نے ایک ریکارڈ کو چار پانچ دفعہ ہی بجایا تھا یہ اس سے پہلے جب میں اپنی زندگی کو گرتے ہوئے محسوس کر رہی تھی ۔ سہارا ڈھونڈنے کے لئے میری آنکھیں حیران سی ، رہتیں پھٹی پھٹی سی۔ مگر نہ جانے باریک باریک سے پردے ٹمیالے سے سیاہ سے میرے چاروں طرف کیوں پڑ گئے تھے ۔جن میں سے میں صرف چمکتے ہوئے چاند کو دیکھ سکتی تھی ۔ ننھے ننھے تاروں کو دیکھ سکتی تھی ۔ مہکتے ہوئے پھولوں کو حاصل کرنے کے تصورات میں ساری راتیں جاگ کر گذار دیتی ۔میری آنکھیں اور بھی سرخ اور پھٹی پھٹی سی ہو جاتیں ، کھلی کھلی حیران سی آنکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کانٹا زور سے پھر چبھا ۔اس کی چبھن آنکھوں سے آنسو کھینچ لائی ـــــــــ میری کمر دکھنے لگی ، اور کھانسی پھر زور سے اٹھنے لگی۔

خالہ جان کا ڈر ـــــــ ڈاکٹروں کا حکم ـــــــ ٹی بی ـــــ

تازہ ہوا ـــــــ احمق ڈاکٹر، کوئی کیا جانے زندگی کے چھلنی کرنے والے کانٹے کو نکالنا چاہتے ہیں۔ کن سے، نرم نرم ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں سے ـــــــ انہیں کیا معلوم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ صبح شام کی سیر، جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا مدہوش کر دیتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نرم نرم تھپکیوں سے کانٹے زندگی کو چھیدتے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں ـــــــ اس وقت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زندگی ہچکولے کھانے لگتی ہے ـــــــ سسکتے ہوئے منزل کا سراڈھونڈنے لگتی ہے۔ اس وقت اندھیرے ہیں اسے روشنی کی ضرورت پڑتی ہے ـــــــ جیسے کہ مجھے آج ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی تاریک لمبے چوڑے ہال میں کتنی تاریکی ہے ـــــــ اندھیرا ـــــــ سائیں سائیں کرتی ہوئی میری طرح درماندہ ہوائیں ـــــــ دم توڑتی ہوئی۔ بےچین۔ کسی کے لئے مضطرب ـــــــ کون ۔ ۔ ۔ ۔ وہی پھول ۔ ۔ ۔ ۔ جس کی تر و تازگی دیکھ کر، جس کا معصوم حسن دیکھ کر ـــــــ جس کی مہکتی ہوئی خوشبوؤں نے مجھے بلایا تھا ـــــــ جس نے میری آنکھوں میں ٹھنڈک بھیجدی تھی۔ بالکل نرم نرم ٹھنڈی پتیوں جیسی جن کو میں نے اپنی گرم گرم جلتی ہوئی آنکھوں پر پھیرا تھا ـــــــ اس حسین سے پھول کو میں نے نادانی میں اپنا سمجھ کر اس کو پیار سے بھینچنا چاہا تھا ـــــــ آف ـــــــ نرم نرم

پنکھڑیوں میں پوشیدہ کیسے نوکیلے نوکیلے باریک کانٹے تھے ——
جن میں سے ایک تو اب میری زندگی کو ختم کرنے والا ہے ——
یہی کانٹا میری زندگی کا اب راہ بر ہے ابھی یہ میری زندگی کو اُس
کی دوسری منزل تک لا سکتا ہے —— آسانی سے' میں خاموشی
سے چلی آئی خود ہی۔ تصورات کی دنیا سجائے —— وہی خوبصورت
سی دنیا تھی —— پھولوں سے بھری ہوئی۔ جس کی مہک مجھے
مدہوش کئے ہوئے تھی۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ میں نے . . . . .
میری زندگی نے اُس عزیز ترین ساتھی کے تحفہ کو کیسے سینے میں
جگہ دی —— مگر اب میں خود نڈھال ہو گئی ہوں۔ یہ آخری اور
تیسری منزل اب میں دنیا کی نظروں میں ان کے کندھوں کے سہاروں
سے طے کرسکوں گی —— پھر شاید یہ کانٹا جس کی نوک میرا خون
چوس چوس کر موٹی ہو گئی ہے —— جس نے میرے جسم کا خون چوس
چوس کر خود مجھ کو بھی کانٹا بنا دیا ہے لیکن دفعہ ہی ماٹی کے پردے
چھلنی چھلنی کر دے گا —— بھدے بھدے سے سوراخ ——
جیسے میری زندگی۔ چھلنی کی طرح —— جن کے آر پار اب مزے سے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے . . . . . ہوتے ہوئے صرف
جھنجھناتے چلے جاتے —— جیسے ٹوٹے ہوئے ساز پڑے ہوئے سے

کوئی انگلی پھیر دے۔ بے سُرے تار صرف جھنجھنا اُٹھیں گے۔ اور پھر چاروں طرف خاموشی چھا جائے گی ——— میرے نرم نرم بستر پر میرا کانٹا سا بے جان جسم پڑا ہوگا، چھدا ہوا، گہرے گہرے سوراخ ——— جن کے کناروں پر میرا سرخ سرخ خون جما ہوا سیاہ پڑ جائے گا ——— میرے ارمان جسرتیں بے سُری تانوں میں نغمۂ موت گنگنائیں گی۔۔۔ مگر ——— وہ مدھم سا شور ——— اس دنیا میں سبر کرنے والوں کو کبھی بھی سنائی نہ دے گا ——— اور مہکتے ہوئے پھول خوشی سے اسی طرح جھومتے رہیں گے ——— نرم نرم پتیوں میں کانٹوں کو چھپائے ——— میری روح بے چین پھرے گی ——— مگر میری ملو ——— اف آج یہ ریکارڈ پر ریکارڈ اس اندھیری شام میں بجائے جا رہی ہے ——— افسردہ ہوائیں کانٹوں کا مُنہ چوم جاتی ہیں ——— مگر۔۔۔ وہ پھول کہاں ہے ——— نہ جانے کیا کیا سوچتے سوچتے میں کب سے رو رہی تھی ——— آنسو تھمتے ہی نہیں ——— کھانسی بھی اب نہیں اٹھ رہی ——— آج سے دو سال پہلے کے دن مجھے کھینچے لئے جا رہے تھے ——— جہاں پیاری میٹھی میٹھی سی یادیں مجھے اپنے آغوش میں بلا رہی تھیں ——— میٹھی میٹھی نیندوں میں ڈوبی ہوئی شربتی سی سنہری چمکیلی آنکھیں جن کے نرم نرم چمکیلے پردوں سے

جیسے تیز تیز نوکیلے کانٹوں کی سطح ——— وہی میرا مہکتا ہوا پھول ...
شریر سا خوبصورت حسین سا چہرہ خوبصورت جسم اور پیارے پیارے
خوبصورت، گلابی گلابی رخساروں جیسے ملائم ملائم ہاتھ ——— پیازی
سے لمبے ناخن جیسے اب ذرا سی انگلی دبائی اور زردی کے بعد سرخ
سرخ خون جیسے انگلیوں اور ناخنوں سے بہہ ہی تو جائے گا ———
وہ شگفتہ ——— کھلا کھلا سا چہرہ، گلابی گلابی ——— قہقہوں
سے کھیلتے ہوئے لب ——— کاش میرے قہقہے اس کے قہقہوں
سے نہ ٹکراتے ——— اس کی وہ حاضر جوابی - یعنی میرا بہترین مشغلہ ..
... جو اس نے مجھ سے چھین لیا ——— یاد ہے ———
مجھے ——— ابھی تک تین چار سال کی باتیں جیسے ابھی ایک گھنٹہ پہلے
مجھ پر بیت چکی ہوں ——— گگی ——— صفدر کا بے حد دوست،
عجیب سا انسان ——— ایسی ہی شام کو صفدر نے مسکراتے ہوئے
میرا تعارف بھی گگی سے کرایا تھا - یہ ہیں میرے عزیز ترین دوست
مسٹر گگی ——— اور میں نے گگی کو دیکھا ——— سفید شیروانی
خوبصورت جسم - سیاہ چمکدار بال گلابی گلابی سا چہرہ جو اور بھی سرخ ہو گیا تھا
——— سنہری چمکیلی شریر سی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں ———
کتنا ——— معصوم سا چہرا تھا ابھرے ابھرے نقش ——— اور

گلابی گلابی خوبصورت ہاتھ ـــــ اور لمبی لمبی انگلیوں میں ـــــ
چمکتا ہوا نگ جیسے کانپ رہا ہو۔ آنے والے وقت کے خوف سے۔
میں جیسے اس مسکراتے ہوئے پھول کی مہک سے مدہوش ہوئی جا رہی
تھی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے پھول کی بھینی بھینی خوشبو مجھے کھینچ رہی ہے....
.... میں بھی ہر وقت پھولوں کی کیاریوں کے خواب دیکھتی،
مہکتے ہوئے پھول، جھومتے ہوئے۔ ایک دن ان پھولوں ہی سے ایک
پھول میرے سامنے جھک گیا ـــــ اور میں بھی جھک گئی اُسے
اٹھانے کو ـــــ

اُس رات کھانے کی میز پر.... گگی کی کانپتی ہوئی انگلیوں نے
وہ کانپتے ہوئے نگ کی سفید انگوٹھی میری انگلی میں پہنا دی تھی ـــــ
اور میرے جھکے ہوئے منہ کے نیچے شرارت سے لبریز سنہری آنکھیں
پھیلاتے ہوئے کہا تھا ـــــ شفق ـــــ اس کا مطلب سمجھتی
ہو ـــــ اور میں نے کہا تھا ـــــ نہیں ـــــ جانتے
ہوئے بھی ایسے ہی۔

سرخ لب تھرائے۔ اور میرے ذہن پر میری زندگی پر ـــــ پانچ
سال جیسے نقش بن گئے تھے ـــــ پانچ سال بعد اس کی وجہ
اس کا مطلب تمہیں بتاؤں گا ـــــ میں کتنی خوش تھی ـــــ

میرا جی چاہا کہ اٹھ کر خوب ناچوں خوب قہقہے لگاؤں، دنیا بھر کی خوشی مجھ میں آکر سما گئی تھی —— اور ان سنہری آنکھوں میں جن کے ریشمی نرم سنہری سنہری پردوں کے پیچھے ننھے ننھے نوکیلے کانٹے تھے ...... —— ان میں ہی بسنت بہار تھی اور جیون کا رس سنگھار ——

میرے دل کی دھڑکنیں پانچ سال گننے لگیں —— وہ معصوم سا گگی مجھ سے دور چلا گیا —— شاید کسی اور دنیا کی سیر کرنے —— مگر میرے ہوش و حواس میں مہکتے ہوئے پھول کی خوشبوئیں ہوتی تھیں۔ کانپتے ہوئے نگینے کے ساتھ میں اکثر چاندنی راتوں میں کانپتی ہوئی ندی کے کنارے کانپتے ہوئے چاند کو دیکھا کرتی تھی۔ رات رات بھر —— یا پھر تاریک سے کمرے میں ایک ایک ریکارڈ کو چار چار مرتبہ بجا کر دن کاٹا کرتی تھی۔ گھنگھور گھٹاؤں کے سایوں میں گھنٹوں بیٹھے بیٹھے اونچے محل بنائے۔ جہاں خوشی ہی خوشی ناچتی پھرتی تھی۔ جہاں ہنستے ہوئے دن ناچتی ہوئی راتیں میں اپنے گگی کے ساتھ دو تین گھنٹوں میں گذار چکی تھی —— مگر گگی کی گرجتی ہوئی باتیں جو میری زندگی میں سما گئی تھیں سب —— اس روز کی ملاقات میں چھن گئیں۔ جن کے سہارے میں اتنے دن جیا کی —— اپنے

آپ نہیں تصورات کے سہارے ——

اب بھی وہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اسی طرح سے جیسے میرے سامنے بیٹھے نیچے نظریں کئے ہوئے کہہ رہے ہوں۔ اندھیرے میں چمکتی ہوئی آنکھیں۔ ایک خاص قسم کی سفیدی چہرے پر چمک رہی تھی —— میری شفق ——

میں آج تم سے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں ... مجھے تم جان سے زیادہ عزیز ہو —— مگر —— مگر —— جب دو ہستیاں آپس میں محبت کرنے لگیں تو ...... تو پھر وہ پاک جذبے میں دونوں بہنے لگتے ہیں —— اور میں یہی چاہتا ہوں —— ہم دونوں کے دل پاک ہوں اور جتنا دور رہیں، مگر تخئیل میں اتنے ہی قریب۔ میری بے چینی تم اتنی دور سے محسوس کرو —— جتنی کے میں کروں —— اس وقت میں تمہارے کتنے قریب ہوں جانتی ہو۔ اگر کوئی دوسرا شخص ہو —— تو دیوانہ ہو جائے —— میں اب بہت دور چلا جاؤں گا —— بہت دور بہت ہی دور —— جہاں مجھے کوئی بھی نہ جانے اور نہ میں ہی کسی کو جان سکوں —— تم مجھ کو بھول جانا —— اور میں تم کو بھلانے کے لئے۔ ایسی چیز پیدا کروں گا —— جس کو پی کر ——

تم اور بھی حسین نظر آیا کرو گی۔ میری بے چین زندگی کو کچھ دیر کے لئے سکون مل جایا کرے گا ——

میں جیسے سن سی ہو گئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا۔ جیسے میری بہت ہی قیمتی چیز کسی نے چرالی ہے جسے میں آج تک تین سال سے چھپائے چھپائے چلی آ رہی تھی۔ میں پاگل سی ہو گئی تھی۔ اور میں نے اس کے کانپتی ہوئی انگلیوں پر وہ کانپتی ہوئی انگوٹھی والا ہاتھ رکھدیا تھا —— مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا وہ نجانے کیا کہہ رہا تھا —— ہاں اس نے یہ بھی کہا تھا ——
پاک محبت شادی کے بعد نہیں رہتی۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے ——
اور میں کانپ گئی تھی —— کیا کہا —— آپ کا ذاتی تجربہ —— میں سرد سی پڑ گئی تھی —— اس روز سے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے جسم میں کسی نے کانٹے ہی کانٹے چبھو دیئے ہیں۔ پھولوں کی نرم نرم پتیاں اب مرجھا کر گر پڑی ہیں۔ اور ان نوکیلے کانٹوں نے میری زندگی کو چھلنی چھلنی کر دیا ہے۔ میرے قہقہے، میری مسکراہٹ، میرا وہ چلبلا پن، میرا چین، سب کچھ چھین کر ہر وقت جلنے والی آگ سی سارے جسم میں بھر دی —— اور اب اداس اداس شامیں، سوگوار صبحیں۔ اور سیاہ بھیانک سی راتیں۔

گرم آگ، میں جلتا جسم، اور مہکتے ہوئے پھولوں کا تحفہ ـــــ یہ
نوکیلے تیز تیز سے کانٹے ـــــ جن کی نوکوں نے میرا خون چوس
لیا ہے ـــــ وہ شریر شربتی آنکھیں جن میں دنیا بھر کا چین
تھا ـــــ اب بہت دور نہ جانے کہاں کھو گئیں ـــــ
اب یہ کاغذ پر چمک رہی ہیں۔ یہی لکی کی تصویر ہے جس کے
دیکھنے کے لئے اس تیز بخار میں اپنے کمرے سے یہاں اس اندھیرے
ڈرائنگ روم میں آ گئی ہوں ـــــ اس پھولوں کے گلدان کے
نیچے پھولوں کے سائے تلے یہ میز پر رکھی ہے۔ وہی شریر سی مسکراتی
ہوئی آنکھیں ـــــ وہی مسکراتے ہوئے لب، جیسے قہقہے سہم
کر رہ گئے ہوں۔ وہی سیاہ سے بال جیسے میری اندھیری راتیں ان سے
ٹکرا کر آتی ہوں ـــــ مگر ـــــ فرق اب اتنا ہے ـــــ
کہ تمہاری شفق اب ـــــ رات کی سیاہی میں بدل جانے
والی ہے اس پاک جذبے کے سہارے بیتے دنوں کے سہارے
اب وہ اپنی منزل پر گھسٹتی گھسٹتی آ ہی پہنچے گی۔ دیر ہے تو اتنی یہ ٹی بی
کے سورج کی تیسری اور آخری گھڑی بھی آ پہنچے۔ یہ غروب ہوا اور شفق پر
سیاہی پھیل جائے گی۔ کانٹوں کا زہر اپنا اثر تب دکھائے گا ـــــ
اُف اللہ یہ کھانسی پھر شروع ہو گئی ـــــ خالہ جان نہ آ جائیں

اور یہ صلوات ہوگئی اور اب تک ریکارڈ بجا رہی ہے۔

نین ہین کو راہ دکھاؤ ـــــــ پربھو پگ پگ ٹھوکر کھاؤں نین

ہین کو ـــــــ صلو یہ ریکارڈ بجائے ہی جا رہی تھی۔

راہ دکھاؤ پربھو اور مجھے کھانسی اٹھنے لگی۔ جیسے میرا کام ختم ہونے

والا ہے۔ میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

پگ پگ ٹھوکر کھاؤں پربھو نین ہین کو راہ دکھاؤ۔

آپ نے دونوں غزلیں جو لکھی ہیں۔ منقول عنہ کا ترجمہ فرمائی ہیں۔

یہی فرمایا دوسرے بھی فرمایا۔

م ا جا بار

Up till now those who have criticised are sheer mad. They do not have a decent taste to appreciate such a valueable book.

That is what I have felt.

But in some cases she has faild to express her thougts and

8/100

ٹوٹا ہوا کھلونا

25:7:55

Ideas are not clear

both are fools

Nasim
17-11-56

Yes Mr. 420 you are cent percent right.

Do not argu about a fool writer

ساحرہ، ساحرہ ——— نجمی نے بھیا کے کمرے سے آواز دی —
نجمی آ گئے ——— مجھے چوٹی گوندھنی بھی مصیبت ہو گئی ——— نجمی
میں نے خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے ذرا نام کو غور سے دہرایا ———
نجمی ——— کتنا اچھا نام ہے ——— دوسرے کمرے سے امّی
کی آواز آ رہی تھی۔ شاید نجمی سے کہہ رہی تھیں اُف خدا میں تو اس لڑکی سے
تنگ آ گئی ہوں ——— ہر وقت وہ ہے، کمرہ ہے چوبیس گھنٹے کھڑکی
کھلی ہوئی ٹانگیں پسارے پلنگ پر دراز ہیں۔ یا بہت ہوا تو کہنے سننے سے
سر گوندھ لیا۔ مہینوں ہو جاتے ہیں سر میں تیل تک نہیں ڈالا جاتا ———
ویسے تو ہر مہینے نئے نئے قسم کے تیل آ جاتے ہیں۔ آج امّی یہ بہت ہی اچھا

قسم کا تیل لائی ہوں۔ ذرا سونگھئے تو، زمانے کی رفتار ہی عجب ہوتی جاتی ہے
خدا بُری گھڑی سے بچائے۔ دنیا ڈالتی چلی آتی ہے۔ کبھی کھوپرے کا تیل
ڈال لیا یا وہ دھوئی تلی کا کچی گھانی کا تیل۔ ختم ہوئی بات۔ جمعہ کے جمعہ سر دھو لیا
پھر دیکھو بالوں کی حالت۔ اب تو کم بخت سنہری سے ملگجے ہو گئے موئے نہ
وہ سنہری رہے نہ کالے۔ کچھ عجیب ہی رنگ ہو گیا ہے بالوں کا میں تو
تنگ آ گئی۔ لڑکی جوں جوں سیانی ہوتی جاتی ہے۔ نخرے بڑھتے ہی جاتے
ہیں۔ سہیلیاں دیکھو تو الہٰی توبہ اے بجی اللہ قسم کل ایک صاحبزادی آئیں
بال ایسے تھے جیسے چڑیوں کا گھونسلا۔ بال نہ سیاہ تھے نہ سنہری۔ کچھ عجیب
ہی سے تھے تیل کی شکل تو سالوں نہ دیکھی تھی۔ پھر پھرے سے میرا تو دیکھتے
دیکھتے سر چکرانے لگا۔ کندھوں پہ کھلے ہوئے پڑے تھے۔ کپڑے تو ایسے اچھے
قیمتی پہنے تھے۔ مگر یاں بال نہ دھنے کو ایک چیتھڑا بھی نصیب نہ ہوا میری جان
ہی تو جل گئی۔ اور ہنسی بھی آ گئی کہ اتنی کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ کچھ کہتے ہوئے
بھی تو برا معلوم ہوتا، ماں ٹھہری جولی جیسی غضب کی لڑکی جس کے لئے
لڑکے کناٹ پلیس پہ بیسیوں چکر لگا جاتے ہوں گے کہ شاید مل جائے یا
نظر آ جائے۔ کاش ہم ایک دفعہ بات کر سکتے ——— اور اس غریب
کی یہ درگت بن رہی ہے وہ تو خدا کی ہی کچھ مہربانی ہے جو جولی صاحبہ مجھ
پہ مہربان ہیں ورنہ اور بھی اس کی کلاس فیلو ہیں مگر کبھی جو ڈھنگ سے بات

کی ہو کسی سے ـــــــ

میں نے آخری مرتبہ سر پر کنگھی پھیری۔ قدِ آدم آئینہ میں آج نہ جانے مجھے اپنی شکل کچھ بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ گول چہرہ کو دیکھتے دیکھتے میں اُکتا گئی تھی۔ ہاں البتہ آنکھیں مجھے ہمیشہ اپنی پسند ہیں۔ کیونکہ غور سے دیکھتے دیکھتے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میری نہیں۔ اور شاید مجمی کی یا ان ہی جیسے کسی اور بھائی کی آنکھیں ہوں۔ جو آئینہ میں ملتے ہی۔ منہ سرخ ہو جاتا ہے اور ایک پھریری کے ساتھ۔ سارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے لمبی لمبی انگلیاں خود بخود بند ہو جاتی اور بغیر اجازت کے آنکھیں نیچے جھک جاتیں جیسے کسی کو جھک کر آداب کر رہی ہوں۔ میرے ہاتھ آج حد سے زیادہ سفید نظر آ رہے تھے شاید کالی ساڑھی کی وجہ سے، ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے، میرے ہاتھ اب کمر پر تھے۔ سفید ساٹن کا بلاؤز کمر پر کس قدر فٹ ہے۔ اور جارجٹ کی نرم نرم ساڑھی باریک نرم نرم سی، میری محبوب ساڑھی۔ مگر میرا رنگ زرد کیوں ہے۔ ظاہراً میں سب کو خوش نظر آتی ہوں۔ امی کو یہی فکر دامنگیر ہے کہ تم ہر وقت لیٹی رہتی ہو۔ ہر وقت پڑھتی رہتی ہو ـــــــ ایک کمرے میں گھسے رہنا۔ آخر صحت کیسے قایم رہ سکتی ہے ـــــــ مجھے ان کی باتوں پر باوجود ضبط کے ہنسی آ جاتی ہے۔ مگر اس کے جواب میں ان کی بڑی بڑی حیران نظریں جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کہہ رہی ہوں

کہ لڑکی تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ——— میرا رنگ واقعی زرد ہوتا جا رہا ہے۔ ساڑھی کی پلیٹیں درست کرتے ہوئے میں نے سوچا ——— مگر کیوں؟ میں نے شانوں کے پاس گرم گرم سانس سا محسوس کیا۔ شاید میرا خیال تھا اور میں جھکی ہوئی پلیٹیں درست کر رہی تھی۔ برقی پنکھے کی رفتار شاید خود بخود ہی تیز ہو گئی تھی ——— اور یہ چھوٹے چھوٹے خمدار بال؛ انہیں نہ جانے اس قدر شوخی کیوں سوجھی تھی۔ میں نے بال درست کرنے کی نیت سے آئینہ میں دیکھا اور ذرا ہٹتے ہوئے اپنے پورے جسم کا جائزہ لینا چاہا۔ جو مجھے کسی کا چہرہ مل گیا ——— آئینہ میں اب دو چہرہ نظر آ رہے تھے چار آنکھیں۔ اور دو جسم ——— بالکل قریب۔ نجانے میرے زرد چہرہ پر اس قدر سرخی کہاں سے آگئی تھی ——— پیشانی پر ننھے ننھے پسینہ کے قطرے نہ جانے کہاں سے آگئے تھے۔ میں نے دور ہٹتے ہوئے۔ ایسے غصے سے جس میں خاک بھی غصہ نہ تھا۔ ارے آپ ——— اور میرے ہونٹ آپس میں جڑ گئے۔ ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے میں نیچے نظریں کئے ہوئے۔ اپنے دل کی دھڑکن کا اندازہ لگا رہی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے چمکتے ہوئے پالش ——— پر میرا اسگھڑاپا نظر آ رہا تھا۔ پاؤڈر لگانا بھی نہیں آتا۔ دیکھئے تو کتنا پاؤڈر گرایا ہے؟ ——— کتنے بیہودہ سے انسان ہیں ایک تو بغیر اجازت میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور اوپر سے نصیحت۔ مجھی کے آنے سے پہلے میں کتنی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ میرے دل میں کتنی قدر تھی؛ ذرا

بھی تو خود دار نہیں۔ یہ شخص خود داری ——— خود داری، میری آنکھیں جلنے لگیں۔ کرسی کے گول گول سوراخوں میں ایسا معلوم ہوا جیسے یہ لفظ گول گول گھوم رہے ہیں، مجھے بے اختیار ——— روشدی یاد آ گئے کتنے خود دار ہیں، کیا مجال جو فضول بات منہ سے نکالیں ——— سُرخ و سفید چہرہ مغرور ابرو تیکھے تیکھے نقش۔ سفید سلک کی قمیص عنابی ٹائی اور ——— اور ——— نیلی چمکدار سی آنکھیں، گلابی گیلے گیلے کانپتے ہوئے لب ——— روشدی ——— فلاسفر ——— چہرہ پر ایک طنز یہ مسکراہٹ جولی کی سالگرہ میں شائد ملاقات ہوئی تھی سبھی تو اس کی طرف متوجہ تھیں مگر وہ ہر ایک کا جواب ایک طنز آمیز مسکراہٹ پر ختم کرتا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ اونھ اس قدر غزا۔ اس قدر میک اپ جیسے اپنی ساری زندگی پر میک اپ کر لیا ہو۔ ہر آرزو پر دولت کا روغن کر لیا ہو۔ دماغی احساس مردہ کر کے ظاہرا چلبلا پن سیکھ لیا ہو۔ آنسوؤں کو چھلکنے کے خوف سے آنکھوں کی گہرائیوں میں ہی سلا دیا ہو۔ شاید ان کی چمک ہی کسی کو لا بھائے، ابن آدم اتنے معصوم نہیں ایکٹنگ ہم سے سیکھو۔ ہم پیدائشی ایکٹر ہیں اور اچھے ایکٹر کی تعریف یہی ہے کہ اپنی جان تک خطرہ میں ڈالنے کو تیار رہو تم کہو گی یہ غلط ہے۔ آدم بہت ہی سادہ لوح تھے۔ ہر مرد عورت کے سامنے جھک جاتا ہے۔ یہ اس کی فطری کمزوری ہے۔ مگر جانتی ہو۔ یہ سب غلط ہے۔

کامیاب ایکٹر مر جانا . . . . پسند کرے گا مگر یہ نہیں سننا پسند کرے گا۔ کہ لوگ اس کو یہ کہیں کہ ڈرامہ کا پلاٹ اچھا تھا۔ مگر یہ ایکٹنگ نہ کر سکا ——— کبھی نہیں، وہ ہر قربانی دینے کو تیار ہے تم کہو گی اونہہ اور آدم حوّا کو کتنا چاہتے تھے۔ کہ انہوں نے حوّا کی خواہش پر اپنا عیش و آرام تک چھوڑ دیا۔ کیا یہ غلط ہے۔ نہیں بالکل نہیں مگر آدم ایسے نہ تھے۔ وہ حوا کو احساس دلا چکے تھے میں تم سے محبت کرتا ہوں تمہیں بے انتہا چاہتا ہوں۔ تمہارے بغیر میری دنیا تاریک ہو جائے گی میں تمہارے ایک اشارے پر اپنی ہر خواہش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر سکتا ہوں۔ میری زندگی تم سے ہے۔ میری بہار تم ہو۔ میری خواہشات کا نچوڑ تم ہو۔ میری اندھیری راتوں کا چاند تمہارا حسین چہرہ ہے۔ میری نیندیں تمہاری سیاہ زلفوں میں پوشیدہ ہیں۔ ہر سانس کی گرمی تمہارے تھرتھراتے ہوئے لب ہیں ——— پھر جانتی ہو حوّا کا وہ ——— پہلا حربہ تھا۔ اور آدم کا وہ پہلا امتحان ——— اور آدم کو کہنا ماننا پڑا آنکی ایکٹنگ اتنی کامیاب ہوئی ہم نے ڈرامے کا پہلا سین نہیں دیکھا۔ مگر لوگوں کی زبان سے سنا ہے کتابوں میں پڑھا ہے۔ کتنی شاندار ایکٹنگ تھی اور کتنا کامیاب اثر ہوا۔ جانتی ہو عورت کا دل اُس وقت توڑا جاتا ہے جیسے کوئی بچہ کھیلتے کھیلتے اکتا جائے۔ ہر وقت وہی کھلونا اس کی

نظروں کے سامنے رہے آخر غور سے دیکھتے دیکھتے اس کے چہرہ سے نقاب اٹھ جاتی ہے اور اس کی خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ نظریں جم جاتی ہیں۔ اور کھلونے ہی کا مرکز بن جاتی ہیں۔ رفتہ رفتہ کھلونے میں حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ اور وہ کسی دل کا بہلاوا بن جاتا ہے اسی طرح دن بیت جاتا ہے اور بچہ کھیلتے کھیلتے کھلونے کو لے کر سو جاتا ہے۔ اور ایسا مدہوش ہو جاتا ہے کہ خواب میں بھی وہ کھلونے کے ساتھ ساتھ پھرتا رہتا ہے۔ صبح ہوتے ہی دنیا میں کھلونوں کی دوکانیں سجائی جاتی ہیں۔ بچہ ہمک ہمک کر نیا کھلونا مانگتا ہے پرانے کھلونے کی جگہ اب نئے کھلونے لے لیتا ہے اور پرانا کھلونا منہ چڑا کے پھینک دیا جاتا ہے . . . . اب نئے کھلونے کی رنگینی پر اس کی نظریں جم جاتی ہیں۔ آندھی آتی ہے۔ اندھیری رات میں طوفان آتا ہے۔ بارش ہوتی ہے ٹوٹتے ہوئے کھلونے کا روغن بارش کے پانی سے بہہ جاتا ہے اور مٹی نکل آتی ہے۔ وہ رنگ و روپ نہ جانے کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ لوگوں کی آمد و رفت سے کھلونے کا چورا چورا ہو جاتا ہے پیلے سے رنگ کی مٹی نظر آنے لگتی ہے۔ باریک مٹی ہوا میں مل جاتی ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جھاڑو کی مدد سے کوڑے کے ڈھیر میں اور نیا کھلونا سفید سفید نرم نرم پلنگ پر اپنے ہی جیسے ننھے سے ساتھی کی ننھی ننھی باہوں کی گرفت میں۔ یہاں تک کہ کھڑکی سے سورج کی

کرنیں اندر داخل ہو جاتی ہیں اور ننھے سے چہرہ پر ایک والہانہ مسکراہٹ رقص کرتی نظر آتی۔ بالکل ایسی جیسی روشدی کے چہرہ پر ہر جواب کے بعد مسکراہٹ دوڑ جائے۔ مجھے سخت گرمی لگ رہی تھی۔ پسینے پسینے ہو رہی تھی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا کار کا ہورن زور سے بجا میری آنکھ کھل گئی۔ باہر ہورن زور زور سے بج رہا تھا ——— میں نے اپنے اوپر نظر ڈالی۔ کالی ساڑھی اب جسم سے لپٹ گئی تھی۔ ساٹن کا بلاوز پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ آنکھیں جلنے لگیں ——— ہاتھ پاؤں ایسے ہو گئے تھے جیسے ان میں جان ہی نہ ہو۔ مجھے یاد آیا' اوہ مجھے تو چھ بجے نجمی کی سالگرہ کی پارٹی میں جانا تھا جس کے لئے تیار ہو کر کار کا انتظار کرنے کے لئے کمرے میں پلنگ پر یونہی سا لیٹ گئی تھی۔ گھڑی میں پورے چھ بجے تھے' میرا دل گھبرا رہا تھا۔ کار کا ہورن بجا اور دوسرے کمرے سے امی کی آواز آئی۔

ساحرہ' ساحرہ' بھئی کار آگئی ہے جانا ہے یا نہیں تو بہ بھئی اس لڑکی سے تو میں بیزار ہو گئی ہوں۔ گھنٹوں سے کار کھڑی ہے۔ مگر بیگم صاحب تیار ہی نہیں۔ تمہاری خالہ جان کے ہاں سے دو دفعہ نوکر بھی آیا اور ایک دفعہ نجمی بھی آیا تھا۔ تمہارے کمرے میں گیا اور پھر واپس چلا گیا ——— بھئی عجیب لڑکی ہو تم بھی آخر جا بھی چکو۔ خدا نے خیریت سے ایک سال اور گزار دیا۔ اللہ اُسے خوش رکھے' اللہ اسے زندہ سلامت رکھے' کیا اچھا

بتچہ ہے۔ اور اسی اپنی ملاقاتی خاتون سے باتیں کرنے لگیں۔ او نہ یہ ہم سے بیزار ہیں۔ میں خود دنیا سے بیزار ہوں، میں نہیں جاؤں گی ــــــــ کبھی نہیں جاؤں گی۔ خیریت سے ایک سال اور بیت گیا۔ اونہ میری زندگی ایک سال فریب میں گذری۔ تین سال اور ابھی کھیلنے میں گذریں گے۔ اور پھر پہلا کھلونا توڑ دیا جائے گا ــــــــ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ زرد زرد انگلیوں میں جلن سی ہونے لگی ہیرے کی انگوٹھی انگلی کو بھینچ رہی تھی میری روح کانپ گئی ــــــــ میں نے آئینہ میں شکل دیکھی سونے سے پہلے کالی ساڑھی کے آنچل میں زرد چہرہ سفیدی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ زردی غائب تھی اور رخسار گلابی۔ خشک ہونٹ گیلے اور سرخ تھے۔ مگر ــــــــ مگر ــــــــ اب آنکھ کھلنے پر وہی زرد چہرہ تھا۔ ہونٹ خشک تھے۔ پسینہ پونچھنے سے سفید رومال کو دیکھا تو اس کی سفیدی کچھ سیاہی اور سرخی میں تبدیل ہو گئی تھی اور میری شکل بالکل ایسی ہو گئی تھی ــــــــ جیسے ٹوٹے ہوئے کھلونے کی بارش کے بعد ــــــــ میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں ــــــــ اور ایسا معلوم ہوا جیسے نجمی کے پیروں پر میری انگلی کی انگوٹھی خود بخود نکل کر گر پڑی ہے۔ نجمی کے لب کانپ رہے تھے۔ جیسے کہہ رہا ہو میری بہار تم ہو، تمہارے بغیر میری دنیا تاریک ہو جائے گی۔ میری نیندیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری ان زلفوں میں روپوش ہو جائے گی ــــــــ میں چیخ اٹھی، ایں! ام

یہ تمہارا ہی حصہ ہے کاش میں بھی ایسی کامیاب ایکٹنگ کر سکتی ——— اس ڈراما کا اینڈ یہی ہونا چاہئے تھا ———

پردہ گر جائے، بس نجمی بس ——— میرا سانس گھٹ رہا تھا ——— میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اور زور سے ہوا چلنے لگی ——— آندھی آئی بادل گرجے اور زور شور سے بارش شروع ہو گئی ———

میری روح کانپ رہی تھی۔ میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے سے ہو گئے جیسے مجھے کسی نے اوپر سے پھینک دیا ہو۔ سانس آہستہ آہستہ چل رہا تھا ——— کسی کے قہقہوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ نجمی اور روحہ مجھے لینے آئے تھے مجھے دونوں کی شکلوں سے نفرت سی ہو گئی۔ روحہ نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ساحرہ تمہیں کیا ہوا۔ سب انتظار کر رہے ہیں ——— اُف اللہ تمہارا رنگ کیوں زرد ہو رہا ہے۔ اور پسینہ، پنکھا بھی چل رہا ہے، آخر کیوں؟ ——— روحہ آج اتنی خوش کیوں ہے۔ میں نے اس کے چمکتے ہوئے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ اور یہ زرق برق عنابی ساڑھی۔ میں نے اچٹتی ہوئی نظر آئینہ پر ڈالی دو شاداب چمکتے ہوئے سرخ و سفید چہروں کے بیچ میں، کالے آنچل میں کمہلایا ہوا زرد چہرہ ——— آنسوؤں سے لبریز آنکھیں ——— صرف شیشے سے ٹکرا کر رہ گئیں، اور پھر جوش نظریں آپس میں سما گئیں ———

میرے زرد ہاتھوں کو دباتے ہوئے روحہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ساحرہ نجمی بھیا نے اپنی سال گرہ میں تمہیں کیا دیا۔ وہ مسکرا رہی تھی اس کی آنکھیں مجھ پہ مسکرا رہی تھیں۔ نجمی نے گھبراتے ہوئے جواب دیا ابھی ——— ابھی انہیں کچھ بھی نہیں دیا کیونکہ انہیں شاید اتنی خوشی تھی اس کا ثبوت ان کی یہ دیر اور یہ کالی ساڑھی ——— ہاں اگر یہ دیر کی معافی مانگیں اور ساڑھی چینج کر لیں تو ہم پھر انہیں ایک ایسی چیز دیں گے جو تمہیں بھی نہیں ملے گی۔

میں نے روحہ کی طرف دیکھا۔ اس کے سرخ چہرہ میں کچھ کچھ زردی جھلک رہی تھی۔ مگر میری طرف دیکھتے ہی مسکرانے لگی۔ ساحرہ مجھے نجمی بھائی نے ایک چیز دی ہے یہ کہہ کر اس نے اپنے سفید ہاتھ میرے زرد ہاتھوں پہ رکھ دیئے۔ اس کی لمبی لمبی انگلیوں میں سرخ رنگ کی نئی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا میرے زرد ہاتھوں کی انگلی میں انگلی کو بھینچ دینے والی سفید ہیرے کی انگوٹھی تھی جس کا نگ کانپ رہا تھا ——— میری پیشانی پہ ایسا معلوم ہوا جیسے ٹھنڈے پانی کو فواروں کی صورت میں کوئی بہار ہا ہو ——— میں نے بوجھل نگاہیں نجمی کے چہرے پہ گاڑ دیں ——— وہ بے حد گھبرایا ہوا سا تھا۔ پیشانی پسینے سے تربتر تھی۔ اور امی کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے خدا عمر دے کتنا اچھا بچہ ہے۔ جو روحہ کی اس آواز نے چونکا دیا۔ نجمی تم ساحرہ کو کیا دو گے اگر یہ ساڑھی چینج کر لیں اس کی مسکراہٹ میں جلن کروٹ

ے رہی تھی میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ــــــــ میں بتاؤں
ــــــــ ہاں ہاں نجمی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا میں نے روحہ کی خوفزدہ
نظروں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ٹوٹا ہوا کھلونا میرا جی چاہا خوب ہنسوں زور زور
سے قہقہہ ماروں کہ دونوں کے کان پھٹنے لگیں۔ مگر میری انگلیاں اب ہیرے
کی انگوٹھی اتار کر زبردستی روحہ کی انگلیوں میں پہنا رہی تھی۔ اور میں نے بمشکل
کھڑے ہو کر جھکتے ہوئے روحہ کی گرم پیشانی پر اپنے خشک ہونٹ چھواتے
ہوئے کہا۔ چلو روحہ پیاری مجھے یہ کالی ساڑھی بے حد پسند ہے۔ اٹھو روحہ
کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دونوں
انگلیوں میں ایک ساتھ دو نگ چمک رہے تھے سفید و سرخ جیسے شروع
شروع میں ان دونوں کے چہرے میں نے بے تاب ہو کر اپنی زرد انگلیوں
میں کالی ساڑھی کا آنچل لپیٹنا شروع کر دیا۔ چلو، میں تیار ہوں' میں نے کانپتے
ہوئے کہا مگر ایسا معلوم ہوا جیسے دونوں اپنی جگہ پر جم گئے ہوں۔ میری نگاہوں
کے سامنے ایک کالا سا پردہ پڑ گیا۔ دل جیسے اب پانی میں ڈوبنے ہی والا تھا۔
کچھ دیر سکون رہا اندھیرے میں میرا دل گھبرانے لگا' جیسے بارش ہونے
لگی میں نے دیکھا۔ بارش کے پانی سے ٹوٹے ہوئے کھلونے کا رنگ روغن
سب غائب ہو چکا تھا۔ مگر گیلی گیلی پیلی پیلی ٹوٹے ہوئے کھلونے کی مٹی پانی میں
بہہ بہہ کر چاروں طرف عجیب عجیب شکل بنا رہی تھی ــــــــ روحہ کا مسکرانا

ہوا چہرہ نجمی کا خوفزدہ چہرہ اور روشندی کی طنزیہ مسکراہٹ نجمی کے ساتھ ساتھ کہہ رہا تھا۔ روحہ تم تو مجھے چھوڑ نہ جانا۔ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ میری زندگی اب تم ہو صرف تم۔ میری بہار مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔ میرے کانوں میں روشنی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ جیسے وہ مسکرا کر کہہ رہا ہو او نہ تم جانو دختر حوا ابنِ آدم اتنا بیوقوف ہے۔ یہ بہترین ایکٹر اپنی ایکٹنگ میں بڑی بڑی قربانیاں کرسکتا ہے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے بارش ہونے لگی میرے منہ پر بوندیں پڑنے لگیں گھبرا کر آنکھ کھولی۔ میرا ان تھی چاروں طرف گھر کے آدمی نظر آنے لگے سب کے رنگ فق تھے ——— امی کی آنکھیں شاید رو رو کر سوجھ گئیں تھیں۔ اور ڈاکٹر نے آہستہ سے نجمی کو انگریزی میں کہا کہ مریضہ کے دل پر بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ اب ذرا احتیاط کیجئے گا۔

اف اللہ میرا سانس گھٹنے لگا اور میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ میں نے ہلکے سے بے اختیار چیختے ہوئے کہا ابن آدم ——— ٹوٹا ہوا کھلونا۔ اور امی کے الفاظ دور سے سنائی دے رہے تھے خدایا میری بچی کو بچا آج اس نے کالی ساڑھی پہنی ہے۔ ہر وقت اپنے کمرے میں اکیلی پڑی رہتی ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ کنوارا پنڈا ہے اچھی بُری روحوں کا گذر ہوتا ہی رہتا ہے۔

کسی چیز کے گرنے سے میری آنکھ کھل گئی میں چونک پڑی نجمی اور روحہ

جا چکے تھے۔ کیونکہ دیر ہو رہی تھی۔ پرویز زور زور سے رو رہا تھا۔ جسے آپا جان بڑی مشکل سے خاموش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ نہیں نہیں کھلونا میرا کھلونا ــــــــ وہ زور زور سے چیخ رہا تھا ــــــــ

میرے سر میں درد ہونے لگا۔ آپا جان کیوں رو رہا ہے بھئی کیا کروں یہ بھی مصیبت ہے۔ کھلونا ٹوٹ گیا۔ کل بازار سے اور لا دوں گی پرویز چپکے ہو جاؤ ــــــــ خالہ جان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اور پرویز میری طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا ــــــــ اور انگلی ٹوٹے ہوئے کھلونے کی طرف تھی ــــــــ

دو آنے
میں
ایک پیالی چائے بغیر شکر کے

راموا لے یہ پیسے ـــــ کمل نے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا ـــــ راموا بابوجی۔۔۔۔۔ کیسے پیسے۔۔۔۔ میں لے لوں۔۔۔ رامو۔۔۔ نے ڈرتے ڈرتے۔۔۔۔۔ پھر پوچھا۔۔۔۔۔ بابوجی یہ میں لے لوں۔۔۔۔۔ پیسے۔۔۔۔۔ ہاں ہاں کمل نے تنگ آکر تیز لہجے میں کہا۔۔۔ جس میں کچھ نرمی کی جھلک بھی تھی۔۔۔۔۔

راموکا چھوٹا سا منہ کھل گیا۔ اس کے سیاہ چہرہ پر سرخی چھا گئی۔۔۔ آدھی پیشانی سے ڈھکی ہوئی موٹی آنکھیں جن میں آنسوؤں نے مستقل حلقہ سا بنا رکھا تھا۔ جن میں کبھی فاقہ مستی کی جھلک پائی جاتی تھی! آج۔۔۔ آج۔۔۔۔ پہلی بار ان میں چمک پیدا ہوئی۔۔۔۔۔ اس نے۔۔۔

اپنے کھلے ہوئے گریبان کے آدھے ٹوٹے ہوئے بٹن کو مروڑتے ہوئے ..
پوچھا۔ بابوجی یہ کتنے پیسے ہیں ... دوآنے بیوقوف لڑکے... دوآنے
..... کمل نے نیم غصہ میں کہا۔
رامو نے ..... دو میلی اکنیاں کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اٹھاتے
ہوئے .... کمل کے پیر چھوئے ..... اور اپنی میلی پھٹی ہوئی....
دھوتی کی انٹی میں باندھ لیں .... آج پہلی بار اس کو اتنی مسرت حاصل
ہوئی تھی.... آج وہ اپنے گاؤں کے زمیندار کے لڑکے راجو سے
مقابلہ کرسکتا تھا....... وہ نہ جانے کیا کیا منصوبے باندھ رہا تھا۔
..... کہ دفعتہً...... وہ زور سے ہل گیا ..... گویا اس پر بجلی گر پڑی
ہو.... وہ تھی کمل بابو کی ماتا کی آواز ..... کیوں رے .....
رامو۔ یہ پیسے کیسے ہیں...... رامو..... اپنے میلے زرد دانتوں کو
اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے صاف کرنے لگا.... کچھ نہیں ماں...
کمل نے ذرا تیز لہجے میں کہا .... سریش کی ماں نے دیئے تھے.....
کیوں .... رنبھا نے حیرت سے پوچھا..... ماں وہ بیمار ہیں....
ڈاکٹر نے ان کا بلغم مانگا تھا۔ ٹسٹ کرنے کو...... وہ بلغم ایک شیشی
میں تھا..... اس کو اٹھانا تھا..... اور ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا...
میں اس کو لے گیا تھا۔ واپس آتے وقت سریش کی ماں نے .....

دو آنے دیئے تھے۔

ماں...... اور ماں..... دیکھ میں کیا چیز لایا...... مگر دکھاؤں گا نہیں...... ماں...... آج میں بھی راجو کی طرح سے ہو گیا ناماں...
رانی نے...... لمبی آہ کھینچ کر کہا...... ہاں بیٹا...... تو راجو...... ہو گیا...... پرماتما کرے تجھے راجو جیسا مگر ہمارے ایسے بھاگ کہاں...... مگر میں تو تجھ کو راجو ہی سمجھتی ہوں...... تو میرا راجو ہے...... آخر لایا کیا ہے بیٹا...... رانی کی آنکھوں کے سامنے ایک دم دو انگلیاں ناچنے لگیں...... ماں دو آنے...... دو آنے۔ رانی کے کھردرے پاؤں پر دو میلی اکنیاں پڑی تھیں...... رانی...... کہاں سے لایا بیٹا...... رانی نے خوفزدہ ہو کر پوچھا...... یہ ماں بابو جی نے دئیے ہیں۔ خوشی سے ناچتے ہوئے رامو نے دوڑ کر ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔
ایک دل جو حوادثات اور مسلسل غم و یاس کے ہاتھوں سے چور ہو چکا تھا۔ جس کی ساری امنگیں پامال ہو چکی تھیں...... اب حدِ نظر پر آندھیوں کی پناہ میں امید کا صرف ایک دیا ٹمٹما رہا تھا اس کی کشتیِ حیات ساحل سے لگنے والی تھی...... اس ٹوٹتے ہوئے دل کی مدہم آواز...... دوسرا ننھا دھڑکتا ہوا دل...... دنیا کے نشیب و فراز سے بے خبر...... دونوں دھڑکتے ہوئے دلوں کی آوازیں...... تیز ہوتی چلی گئیں......

رامو آج مجھے سخت بخار ہے کیا تو پانی بھر لائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رامو نے اپنی بوسیدہ جیب میں دو آنے ڈالے اور میلی سی صراحی سر پر رکھ کے سامنے والے کنوئیں پر جا پہنچا۔ چھوٹی سی باٹی سے وہ پانی کھینچنے لگا۔ بار بار جھک کر وہ باٹی کو دیکھ لیتا تھا۔ آخری دفعہ باٹی نکالنے کو وہ جونہی جھکا ایک ہلکی سی آواز ہوئی اور ساتھ ہی پانی کی سطح پر دو بلبلے اٹھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور غائب ۔ ۔ ۔ ۔ یہ دنیا کے حسن کی معمولی سی جھلک تھی جو غائب ہو چکی تھی۔ اور دو اکنیاں کنوئیں کی تہ میں پڑی ہوئی رامو پر مسکرا رہی تھیں۔

ڈرامہ میں بھی سنسنی ہو گی کہیں نہیں [illegible]!

نیلی فراک

اور

سفید جھنڈی

تبصرہ

~~افسانہ نگاری کا مسئلہ اور اُس کے خیال غیب~~

بی بی جی! آپ کو نوکر کی ضرورت ہے۔ گرم کمرے میں اس کے برف جیسے
ٹھنڈے پاؤں ـــــ کچھ دیر کے لئے ایسے ہو گئے جیسے ان میں جان ہی نہیں ـــ
وہ بغیر اجازت نرم نرم قالین پر بے تکان بیٹھ گئی ـــــ گویا وہ اس کا گھر تھا ـــ
میز کے چاروں طرف . . . . سرخ و سفید چہرہ۔ شاید اس ہی کی طرف متوجہ تھے
ـــــ وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ بغیر پوچھے گچھے۔ نوکروں سے جان بچاتی ہوئی، پالتو
کتوں کی نظروں سے بچتی ہوئی۔ نہ جانے کس مشکل سے یہاں تک پہنچی ـــ اور اب
زبان کام نہیں کرتی۔ بے قرار دل دھڑکنے کے سوا شاید کچھ جانتا ہی نہیں ہاتھ بغیر ضرورت
کے کانپ رہے ہیں۔ حلق نہ جانے کیوں اس قدر خشک ہو گیا ہے۔ گردن جھکی جا رہی
ہے ـــــ دوپٹے کو بھی آج ضد ہو گئی ہے ـــــ گھڑی گھڑی سر سے اتر

جاتا ہے اور انگلیوں میں طاقت نہیں ــــــ پاؤں سن ہو گئے ہیں ــــــ
بدن سرد ہو گیا ہے۔ مگر رخسار اور کانوں کی لوئیں۔ اور آنکھیں اس قدر جل رہی ہیں۔
جیسے سارے بدن کی گرمی ان میں سمٹ کے آگئی ہو ــــــ اگر نگاہیں اٹھتی بھی
ہیں۔ تو ــــــ نہ جانے کیوں دوسری نگاہوں سے ٹکرا کر زمین میں گڑ جاتی ہیں
ــــــ اور سپید دوپٹہ کا پلو انگلیوں میں لپیٹتے لپیٹتے اب عنقریب چر سے پھٹ
جائے گا۔ اور شاید پھر مجھے اپنی بے بسی پر اپنی اس گھبراہٹ پر اپنی اُن اُبھری ہوئی
کلائیوں کی بوٹیاں۔ نوچنے کو جی چاہے گا ــــــ مگر اپنی بے بسی کا احساس کرتے
ہوئے سوائے رونے کے اور کچھ نہ کر سکوں گی ــــــ ہائے عورت
کتنی مجبور ہے ــــــ بہت سے آدمیوں سے سنا تھا۔ نواب صاحب بڑے
شریف اور کنبہ پرور آدمی ہیں۔ ہر غریب کی مدد اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر
غریب عورتوں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ خیر سے چار لڑکے ہیں۔ چاروں کے چاروں
اللہ میاں کی گائیں ہیں۔ شرم میں تو لڑکیوں کو مات کرتے ہیں۔ کھانے کے وقت
زبان ہلاتے نہیں آئے۔ باقی وقت نظر تو آجائیں ــــــ خوبصورت ایسے کہ
سارے شہر میں چراغ لے کے ڈھونڈو تو بھی نصیب نہ ہوں ــــــ عالم خاں
اور نہ جانے کیا کیا ــــــ وہ مکان دار کی لڑکی رضیہ کہہ رہی تھی ــــــ ادھر
میں تو کبھی بھی ایسی باتیں نہ سنتی۔ مگر وقت سب کچھ کراتا ہے۔ اور پھر پڑھی نہ لکھی ــــــ
اب دنیا میں کون تھا اس کا ــــــ اندھا کیا چاہے۔ دو آنکھیں۔ ایسے شریف نواب

کی دو حور سی لڑکیاں بھی تھی۔ چھوٹی لڑکی ذرا لاڈلی ہے اس لئے اس کی ہم عمر ایک لڑکی
کی ضرورت تھی۔ جو صرف ان کا دل بہلائے ــــــــــ مگر ــــــــ کیا اس کے
پاس ایسا دل نہ تھا۔ کاش اس کا باپ بھی نواب ہوتا ــــــــ مگر شریف تو تھا۔
مگر اب تو اتنی لمبی چوڑی دنیا کے اوپر اتنے لمبے چوڑے آسمان کے نیچے کوئی بھی تو اس
کا نہ تھا ــــــــــ اور پھر پہاڑ سی زندگی کاٹنی وہ بھی ایک لڑکی کو جو وقت کے
ساتھ عورت بھی بنے شائد انکار نہ کرے۔ کتنے عیش کی زندگی تھی اس کی۔ جب
وہ چھوٹی سی ناسمجھ لڑکی تھی۔ اس کا جی چاہتا وہ پڑوس کی دادی سے اپنے بچپن کے زمانے
کی باتیں ہمیشہ ہمیشہ سنتی رہے جو کبھی ختم نہ ہوں۔ بوسیدہ پھٹی ہوئی گدڑی لپیٹے ہوئے بوڑھی
دادی۔ جاڑوں کی اندھیری رات۔ اندھیری سی کوٹھری۔ پھٹی ہوئی دری کا بستر۔ ہر ہوا کے
جھونکے سے۔ وہ ٹمٹماتا ہوا دیا۔ ایک ہکی سی دبھرتا تھا۔ مگر فوراً ہی دادی کے سفید بال چمکنے
لگتے تھے اور پھر دادی کی گدلی سی آنکھیں کتنے غور سے کوٹھری کے دروازے کی طرف
دیکھنے لگتی تھیں سن سن کرتے ہوئے کچھ سائے سے اس کے پاس سے گذر جاتے
تھے۔ کوٹھری کے دروازوں کی درزوں میں سے کمیٹی کے لمپ کی روشنی، اندر
جھانکنے لگتی۔ جیسے باہر کوئی پھلجھڑی جلا رہا ہو۔ اور اس کے تارے سے اندر آ آ کر گر رہے
ہوں۔ مگر اس کا دل گھبرانے لگتا۔ اور وہ دادی کے نرم نرم کلیجے سے ہاتھ دباتے ہوئے
چلا اٹھتی۔ دادی ہاں پھر میری ماں کی کیسی شکل تھی وہ کیسے کپڑے پہنتی تھی ابا سارے
روپے اماں کو دیدیتے تھے۔ میرے لئے کیسے کپڑے لاتے تھے۔ ہمارا مکان کتنا بڑا تھا۔

اتنے سارے سوال سن کر بوڑھی کھوسٹ دادی میرا ہاتھ جھٹک دیتی۔ اوہ لڑکی کتنی دفعہ تو تم کو بتایا اور ایک لمبی سی آہ کھینچ کر دادا جان کی تعریفیں شروع کر دیتیں۔ اللہ بخشے تیرے دادا تجھ کو بڑا چاہتے تھے وہ بڑے خوبصورت تھے۔ تیری طرح ان کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ میرا اتنا خیال رکھتے تھے۔ کبھی میرا دل میلا نہیں کیا۔ اونہہ وہ چڑ جاتی اور چپکے سے اپنے گھٹنوں میں اپنا منہ چھپا لیتی۔ اور نہ جانے کب سو جاتی تھی۔ اس کو دادی پسند تھیں۔ وہ خوشی سے ان کا سارا کام کرتی۔ جمعرات کو محلے سے بڑے بڑے آدمیوں کے گھروں سے کھانا بھی لاتی تھی۔ کس لئے صرف اپنے بچپنے کے قصے سننے کے لئے مگر آخری دفعہ دادی اس کا جی جلا دیتی۔ کہانی کا خاتمہ تیرا دادا ایسا تھا ویسا تھا اس کو نہ جانے کیوں اس سے نفرت سی ہو گئی تھی —— اس کو اب اپنی زندگی سے نفرت تھی۔ کیا وہ شریف نہیں۔ لڑکی تمہارا کیا نام ہے؟ اس کی دنیا، اس شیریں آواز میں گم ہو گئی۔ وہ چونک پڑی۔ وہی گرم سا کمرہ۔ نرم نرم گرم سے قالین۔ میز کے چاروں طرف سرخ و سفید مسکراتے ہوئے چہرے۔ چاروں طرف قد آدم شفاف سے آئینے جن میں وہ میز اور سرخ و سفید چہرے سے چمکدار پیشانیاں۔ مسکراتے ہوئے گلابی گلابی لب۔ وہ جھنجلا کر۔ آج مدت بعد آئینے میں خود کو دیکھ رہی تھی ——

اچھی خاصی شکل تھی اس کی۔ گورا گورا کتابی چہرہ۔ بڑی بڑی سیاہ۔ حیران سی آنکھیں جو کبھی کبھی گھنی سیاہ نوکیلی پلکوں میں شرارتاً چھپ جانے کی کوشش کرتیں، پتلے پتلے کیوپڈ کی کمان جیسے ہونٹ مگر مرجھائے ہوئے۔ نہ جانے اس کے لب سرخ و ترو

تازہ کیوں نہ تھے - جیسے آئینہ میں کانپتے ہوئے سرخ گیلے گیلے چمکدار سے ہونٹ - مگر اس کے اس قدر خشک کیوں ہیں بار بار زبان سے تر کرنے پڑتے تھے - نگاہیں اُٹھتے اُٹھتے اس کے سیاہ چمکدار بالوں پر پڑیں - ہائے میرے بال کتنے اچھے ہیں لہریں سی بل کھاتی ہوئی لٹیں - اس کے سفید سفید رخساروں پر نثار ہو رہی تھیں سیاہ کھنچے ہوئے ابرو - کسی اُجڑے کھجڑے مغل خاندان کے نشان معلوم دیتے تھے سیاہ بالوں کے بیچ میں باریک سی سفید مانگ جیسے گھنگھور سیاہ سی بدلیوں میں کبھی کبھی سفید باریک سی بجلی تڑپ کر کھنچ جاتی ہو ——— سر پر پڑا ہوا ملگجا سادوپٹہ - ہر بار سرک جاتا تھا - کتنے نیلے کپڑے ہیں اس کے، اتنے میں دو آنکھیں برابر اس کو دیکھ رہی تھیں، وہ چونک پڑی - سفید چمکدار چوڑی سی پیشانی بھورے بھورے لہروں والے بال - نیلی بڑی بڑی چمکدار متجسس آنکھیں - کانپتے ہوئے سرخ گیلے گیلے چمکدار لب بھورے رنگ کا کوٹ - جس کا رنگ بالوں کو دیکھ کر شرما رہا تھا ——— کئی دفعہ سیاہ اور نیلی آنکھوں میں مقابلہ ہوا مگر سیاہ نگاہیں - خود بخود ہار کر - گرم گرم قالین میں کھو جانے کی کوشش کرنے لگتی -

——— تم نے اپنا نام نہیں بتایا - اور ساتھ ہی زور سے کسی کے ہاتھ سے چمچہ گر پڑا - بھورے کوٹ والا مسکرایا - اور چمچہ اٹھاتے ہوئے (SORRY) کچھ کہا جسے وہ خاک بھی نہ سمجھ سکی - میرا نام ——— میرا نام عذرا ہے - اس کے ہونٹ کانپنے لگے - اور نہ جانے آنکھوں میں کیوں آنسو آ گئے - تم کو یہاں کس

نے بھیجا ـــــ چائے کی خالی پیالی رکھتے ہوئے۔ ایک نوعمر حسین لڑکی نے اپنے سرخ ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے ـــ پوچھا۔ جس سے سرخ ہونٹ چند لمحے زرد رہنے کے بعد اور بھی سرخ ہو گئے۔ میں خود یہاں آئی ہوں بیگم صاحب میں بہت غریب ہوں میرا کوئی نہیں۔ میرے پڑوس میں ایک لڑکی رہتی ہے۔ اس نے مجھے پتہ بتایا تھا ـــــ اس نے معصومیت سے بڑی بڑی سیاہ آنسوؤں سے لبریز نگاہیں ـــــ اس کی خوبصورت چمکدار پیشانی پر گاڑ دیں دھڑکتے ہوئے دل سے اپنا فیصلہ سننے کے لئے بے قرار تھی ـــــ

نہیں۔ عذرا تم اتنی اداس کیوں ہو۔ تم کو رکھ لیا جائیگا۔ پروین کا کام کرنا۔ مسکراتے ہوئے اپنی نیلگوں آنکھیں پھراتے ہوئے نیلی فراک والی لڑکی پروین کو گود میں بٹھا لیا۔ کیوں پروین تم کو یہ لڑکی پسند ہے ـــــ آپس میں چار نیلی آنکھیں ٹکرائیں۔ سرخ گیلے گیلے چمکدار ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی ـــــ ایک ننھا سا بھورے بالوں سے ڈھکا ہوا سر۔ نرم نرم سی ریشم کی قمیض سے ٹکرا گیا۔ اور دو دل دھڑکنے لگے ـــــ سنو عذرا۔ بے بی کو صبح شام سیر کو لے جایا کرنا۔ ان کا کمرہ صاف کرنا۔ جاؤ اس کمرے کے برابر کا کمرہ بے بی کا ہے' ان کے سینڈل نکال لاؤ۔ وہ ایک منٹ میں کیا کیا سن گئی۔ سینڈل' بے بی کا کمرہ ـــ نیلی فراک والی بے بی پروین۔ صبح شام سیر کو لے جانا ـــــ گرم گرم قالین قد آدم آئینے۔ سرخ گیلے گیلے چمکدار کانپتے ہوئے ہونٹ۔ چمکدار پیشانیاں ـــ

سرخ و سپید چہرہ، نیلگوں متجسس کھلی کھلی نگاہیں۔ بھورے سے سوٹ والا۔ کانپتی ہوئی انگلیاں۔ سزمین پر گرا ہوا چمچہ۔ ریشم کی نرم نرم قمیض۔ اتنی نرم جس کی سطح پر دھڑکتا ہوا دل بھی محسوس ہو سکے ـــــ اس کے پتلے پتلے مرجھائے ہوئے ہونٹ ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اب وہ غلام تھی۔ بھکارن ـــــ کتنا اس کی زندگی میں انقلاب پیدا ہو گیا تھا ـــــ وہ لنگڑاتی ہوئی اٹھی۔ اس کے پاؤں ـــــ نرم نرم قالین پر جیسے جم گئے تھے ـــــ اب وہ کمرے سے باہر تھی۔ نہ جانے کس طرح۔ وہ کمرے سے باہر نکل سکتی ـــــ برآمدے کے چمکتے ہوئے ٹائیلز (TILES) جلدی جلدی اس کی خدمت میں پیش ہو رہے تھے۔ وہ ذرا جھکی ـــــ یہ تو اس کا ہی چہرہ تھا ـــــ کتنا خوبصورت وہ مسکرادی ـــــ بے بی کی شکل سے اس کی شکل کتنی ملتی تھی۔ صرف بے بی کی آنکھیں نیلی تھیں۔ کتنی اچھی آنکھیں۔ اس کا جی چاہا پیار کرے۔ مگر بے بی کے چہرہ پر چمک کسی چیز کی تھی ـــــ وہ آگے نہ سوچ سکی ـــــ

کمرے سے دبے دبے قہقہے باریک ریشمیں پردوں سے ہوا کی مدد سے اس کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ لڑکی تو خوبصورت ہے ممی۔ مگر کتنی معصوم۔ یہ آواز بھورے سوٹ والے لڑکے کی تھی ـــــ جن کے متعلق سنا تھا کہ لڑکے تو چار ہیں۔ ایسے سیدھے جیسے اللہ میاں کی گائے ـــــ وہ کانپ اٹھی ـــــ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کان کی لوئیں جلنے لگیں۔ اس کی نگاہیں بے اختیار

آسمان تک پہنچ گئیں۔ ہلکے نیلے لمبے چوڑے آداس سے آسمان پر دو سفید پرند——
ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے۔ انار کے پیڑ میں نہ جانے کہاں چھپ گئے ——
اس کا جی چاہا کاش وہ بھی اسی طرح کہیں چھپ سکتی ——

دن بھر کام کرتے کرتے اس کا نازک جسم تھک کر چور ہو گیا تھا — مگر بے بی
نے اب تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ بجلی کی تیز روشنی میں بے بی کی قیمتی نیلی فراک —
عذرا کو بہت ہی بھائی تھی —— وہ سوچ رہی تھی —— کہ جب پہلی تاریخ
آئے گی۔ تو وہ بیگم صاحب سے پوچھ کر —— ایسا ہی فراک خریدے گی کیا وہ بھی
پروین کی طرح سے ہو سکتی ہے —— مگر وہ تو بے بی پروین کی غلام ہے
کیا وہ اس کی برابری کر سکتی ہے —— وہ کانپ اٹھی۔ وہ اپنی مالکہ کے خوبصورت
پھولدار سینڈل کو تعجب سے دیکھ رہی تھی —— اس کا ہاتھ بے اختیار نرم
نرم سینڈلز پر تھا —— وہ کتنے نرم تھے، ان کا رنگ کتنا اچھا تھا —
نیلی فراک سے ملتا جلتا —— گہرا نیلا۔ جیسے آسمان گہرا نیلا۔ اودی اودی بدلیوں میں
گھرا ہوا آسمان —— وہ بڑے اطمینان سے ان پر ہاتھ پھیر رہی تھی ——
اس کی انگلیوں پر دو گرم گرم بوندیں گریں —— وہ چونک پڑی۔ آنسو —— وہ
کیوں۔ وہ خود بھی نہ سمجھ سکی ——

وہ اب امیر تھی۔ نوکر چاکر بالکل پروین جیسی تھی۔ ہو بہو وہی ——— اور وہ چمکتی پیشانی۔ نیلگوں آنکھیں۔ سرخ گیلے گیلے کانپتے ہوئے لب۔ سرخ و سفید رنگ بھورے رنگ کا سوٹ جو ہر دار بالوں سے شرماتا ہوا مجبوراً جسم پر تھا ——— وہی اللہ میاں کی گائے ——— آج اس نے نیلی فراک پہنی تھی ——— پروین جیسے سینڈل ——— نیلے۔ اودی اودی بدلیوں جیسے گہرے نیلے سیاہی مائل ——— وہ کتنی خوش تھی انار کے پیڑ کے نیچے میز پر گرم چائے پیالیوں میں رکھی تھی ——— جس کی خوشبو اس کے دماغ میں بڑی تیزی سے گھس رہی تھی ——— بے بی پروین کی سریلی آواز نہ جانے کہاں سے آ رہی تھی۔ وہ اس کو ڈھونڈھنے بھاگی ——— اس کا فراک کانٹوں دار تاروں سے پھٹ گیا۔ وہ زور سے چیخ اٹھی ——— میرا فراک ——— سامنے میز پر گرم گرم چائے کی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں سب چائے پینے میں مشغول تھے ——— پروین کا ریشمی نیلی فراک کا ربن ہوا میں لہرا رہا تھا ——— وہ خاموش تھی ——— اس نے اپنے اوپر نظر ڈالی اس کا پیوند لگا کرتہ ——— جو کل سے کام کاج میں اور بھی میلا ہو گیا تھا ——— اس کے جسم پر تھا ——— دامن پر ایک سوراخ تھا ——— جس میں اس کی دونوں انگلیاں پیوست تھیں ——— اور جو وہ بیہوشی کے عالم میں کافی پھاڑ چکی تھی ——— اس کا جی چاہا زور سے چلائے۔ میری فراک کہاں وہ سینڈل وہ کانٹے دار تاروں کی باڑ کہاں۔ جس پر

سے وہ کود ہی تھی اور فراک کا دامن پھنس کر پھٹ گیا تھا۔ پروین کی فراک کا کمر میں بندھا ہوا ربن ہوا میں شرارتاً سر اٹھا کر دیکھتا تھا اور ہنستے ہنستے سر جھکا لیتا تھا۔ اسے پگلی وہ تو سب خواب تھا۔ قالین کی گرمی سے صبح کی تھکی ہوئی۔ عذرا نہ جانے کب دوسری دنیا میں پہنچ گئی تھی۔ وہ تو سب خواب تھا۔ اس کو قالین کے نرم نرم روئیں ایسے معلوم ہوئے۔ جیسے وہ کانٹوں دار تاروں پر بیٹھی ہے۔ کھانا ختم کرنے کے بعد اب سب چائے پی رہے تھے اور وہ توبے بی کے سینڈل صاف کر رہی تھی ——— سامنے آئینے میں عذرا کی سوجی ہوئی سیاہ آنکھوں سے جن میں نیند کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جن میں حسرت تھی جن میں آرزدگی بے کسی مچل رہی تھی۔ نیلی نیلی بڑی بڑی شفاف کھلی کھلی متجسس آنکھیں ٹکرائیں ——— گیلے گیلے سرخ لب کانپنے لگے رخسار اور کان کی لویں سرخ ہوگئیں۔ لمبی لمبی انگلیوں میں چائے کی پیالی کانپنے لگی ——— مگر چمچہ نہ گرا ——— آنکھوں کی نیلاہٹ میں چمکتی ہوئی روشن اودی اودی روشنی ——— سیاہ پتلیوں کی روشنی میں سما جانا چاہتی تھی۔ عذرا کو ایسا معلوم ہوا ——— جیسے نیلی نیلی شفاف سی گہری گہری چمکدار آنکھوں میں بڑھتے بڑھتے۔ نیلا سا پردہ تیار ہونے لگا چمکدار باریک ریشم سا۔ اس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ گرم گرم آنکھوں سے دو آنسو نکل پڑے۔ اور نیلی روشنی میں اودے رنگ کی نیلی سی چھوٹی سی فراک آنکھوں کی گہرائی میں ناچنے لگی ———

کس کا منہ دیکھا تھا؟

معشوق کا ——— ؟

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اب نہ جانے مجھے کیوں چین نہیں لینے دیتے۔ اور پھر کھڑکی سے۔ بارش کی ننھی ننھی بوندیں لٹکتی ہوئی چک سے ٹکرا ٹکرا کر ہوا کے جھونکے کے ساتھ اسی طرح سے میرے پلنگ سے لٹکے ہوئے ہاتھوں پہ کبھی کبھی ایسے آ آ کر پڑتیں۔ جیسے کوئی منہ دھو کر گیلے گیلے ہاتھوں سے میرے منہ پر بوندیں ٹپکا دے اور میں چونک پڑوں۔ جانتے ہوئے سمجھتے ہوئے کچھ یونہی سا کسمسا کر رہ جاتی۔ گلاب کی کانٹوں دار ٹہنیاں جھوم جھوم کر ایسی شوخ ادا سے اٹھلا کر کھڑکی میں جھانکتی اور پھر نازک سی کمر کو موڑ کر اپنے ساتھیوں میں مل جاتی۔ جیسے منہ چڑا کر کہہ رہی ہوں ؎

زندگی زندہ دلی کا نام ہے ۔ مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

دوسرے کمرے میں واداجان شاید قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ کہ بھائی جان کے کمرے سے ریڈیو کی اس آواز پر آداب عرض ہم دلی سے بول رہے ہیں اس وقت صبح کے ساڑھے سات بجے ہیں۔ اور نہ جانے وہ حضرت بغیر کسی کا جواب سنے ہوئے بکتے رہے۔ بالکل اسی طرح سے جیسے کوئی مداری۔۔۔ کھیل شروع ہونے سے پہلے۔ اپنے ٹوٹے ہوئے سامان کو ایک ایک کر کے نام بتا بتا کے الگ الگ رکھتا جائے۔ اور اس کے چاروں طرف چھوٹے بڑے۔ موٹے موٹے گول چہروں کو گول گول ہاتھ تھامے ہوئے۔ لمبے لمبے پتلے پتلے مرجھائے ہوئے چہروں کو سہارا دیئے ہوئے۔ بڑی بڑی گول گول شفاف سی معصوم سی نگاہیں حیرت سے مداری کے چہروں پر گڑی ہوئی چھوٹے چھوٹے منہ کھلے ہوئے۔ ننھے ننھے دانت آپس میں ٹکرا جائیں۔ ایسے ہی ہماری نگاہیں بھی چھوٹے سے ڈبے پر گڑ جاتی ہیں جہاں مدھم روشنی میں کوئی بھی تو نظر نہیں آتا۔ سانس کے چلنے کی آواز سن سکتے ہیں۔ جذبات کی تیزی محسوس کر سکتے تھے اور آواز کے ہمراہ ذہنی شکل بھی بن جاتی مگر دوسرے فقرے کے ساتھ پہلی شکل مٹ جانے کے بعد نئی آموجود ہوتی۔ یہاں تک کہ سر چکرانے لگتا۔ آنکھیں جلنے لگیں میں یہی سوچتے سوچتے دوبارہ سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ دادا جان کی قرآن شریف پڑھنے کی آواز اب اتنی دیر میں نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ شاید وہ آہستہ آہستہ۔ فرحت جہاں بہو کی بھیرویں میں تبدیل ہو گئی۔ نہ جانے مجھے داداجان پر کیوں رحم سا آنے لگا۔ مگر

ساتھ ہی خیال آیا۔ بھلا وہ کیا ڈسٹرب ہو سکتے ہیں۔ انہیں تو یہ کبھی نہیں پتا کہ یہ
چوتھے تالے میں گا رہی ہے۔ یا اس وقت انہوں نے سرگم میں کیا کمال دکھایا اور
طبلے والے کو کہاں آ کے مارا ہے۔ بھلا انہیں ان چیزوں میں کیا تمیز جو وہ یہ سن کر چونک
پڑتے اور قرآن شریف پڑھتے پڑھتے زور سے کیا کہتے ہیں۔ چلا اٹھتے۔ مگر اس وقت
اس جواب میں ریشمیں ساڑھی سے ڈھکا ہوا سر نہ جھکتا نظر آتا۔ بلکہ وہی مدھم سی
روشنی، اور لمبی سی کالی سخت پیچان ہوئی ــــــــــــــ ساڑھے ساتھ بج
گئے مگر اتنی بات تھی کہ بھیرویں حسن سن کے میری بوجھل آنکھیں اور بھی نیند کی بوجھ
سے جھکنے لگیں اور میں چاہتی تھی کہ نرم نرم بستر میں ایک کروٹ لے کر ہی سو جاؤں۔
مگر کسی کے نرم نرم ٹھنڈے ہاتھ مجھے بری طرح جھنجوڑ رہے تھے۔ ارے
بھئی روحی جلدی اٹھو عجیب کاہل لڑکی ہو۔ کل کس زور شور سے وعدہ کیا تھا۔ روحہ
کو اسکول میں داخل کرانے چلوں گی اور جناب ابھی تک چارپائی پر ہی اینڈ رہی ہیں،
بھئی میں تنگ آ گئی تم سے ہر دفعہ وقت پر دھوکہ دیتی ہو۔ اب بننے سنورنے میں
بھی جناب کو دو گھنٹے لگیں گے۔ مجید کتنی دیر سے ٹانگہ جوڑ لایا ہے۔ ساڑھے سات
بج چکے ہیں اور مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔ میری اپنسٹ لگ جائے گی۔ ہائے
اللہ روحی اٹھو بھی۔ رعنا تیوری پر بل چڑھائے اپنی چوٹی کے چمکیلے عنابی ربن کو مسل
رہی تھی۔ اُف لڑکی جلدی اٹھو۔ کیا مزے میں پڑی ہوئی تیز تیز آنکھوں سے گھور
رہی ہو ـــــ میں کہہ رہی ہوں دیر ہو رہی ہے ـــــ اور رعنا نے

میری نرم نرم باہوں میں زور زور سے چٹکیاں لینی شروع کیں۔ یہ عادت مجھے بڑی بُری معلوم ہوتی۔ میں نے تکلیف سے جان چھڑاتے ہوئے اچھل کر کہا۔ آخر تم اٹھتی کیوں نہیں۔ کل منہ سے پھوٹ دیا ہوتا میں تکلیف نہیں فرما سکتی۔ اُف اللہ کس قدر بیہودہ انسان ہو ——— تنگ کر دیا۔ بھلا آج تم اسکول کیوں جا رہی ہو۔ دیکھو کتنا اچھا موسم ہے ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی ہیں کیا خاک پڑھائی میں دل لگے گا ——— فرحہ کو آج نہیں داخل کرنا چاہئے۔ میں نے ہنسی کو روکتے ہوئے اپنی انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے۔ رعنا کے گورے گورے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھنے لگی ——— بہت بہتر معاف کیجئے میں نے آپ کی نیند خراب کی ایسے اچھے موسم میں ہم جیسے بدمزاق لوگ کیا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ اُف مجھے کس قدر دیر ہو گئی۔ مس ہنی نے میری اپسنٹ لگا دی ہوگی ——— فرحہ، فرحہ بھئی تم خود چلی جاؤ۔ روحی آج نہیں جا سکتی کیونکہ موسم آج اچھا ہے آج ان کی طبیعت بہار پر ہے رعنا سرخ چہرہ کئے ہوئے اپنی چوٹی کے عنابی ربن کو زوروں میں مسلتی ہوئی شان سے پردہ اٹھا کر نکلنا چاہتی تھی کہ مجھے رحم آ گیا۔

سنو۔ رعنا جی۔ ہم چلیں گے رعنا جی خفا مت ہو۔ میں نے اس کے غصے والے چہرے کو اوپر اٹھاتے ہی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ——— میں ابھی یہ سفید ساڑھی پہن کر تیار ہوئی جاتی ہوں۔ رعنا جی۔ مجھے دیر نہیں لگے گی تمہاری طرح۔ کیونکہ یہ دو چوٹیاں گوندنے میں کافی دیر لگتی ہے۔ رعنا جی آپ کی طرح اور پھر سوٹ کے ساتھ

پیچ کرتے ہوئے رہن نہ ہوتا تو ——— میں بد ذوق لڑکی کہلاتی ——— کہو
ناراض تو نہیں سچ سچ کل پانچ منٹ" اونلی فائو منٹس" رعنا جی۔ میں نے گرم گرم
ہاتھوں سے سرد چہرہ اونچا کیا۔ چہرہ اب سرخی میں تبدیل ہوگیا تھا سیاہ آنکھوں
میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ اور ایک قہقہہ کے ساتھ رعنا کی ایکٹنگ ختم ہوگئی
تھی۔ آؤ اسی میں ——— اچھی روحی جلدی سے تیار ہو جاؤ ہم ٹانگے میں بیٹھتے
ہیں ذرا تمہارے ساتھ جانے میں مزا آتا ہے روحی جی۔ جلدی کرو اب تم، میں برقعہ
پہنتی ہوں وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی غائب ہوگئی ——— اب میں عجیب
مشکل میں تھی۔ اب جانا ہی پڑے گا۔ کیا مصیبت ہے یہ، رشتے کی بہن۔ اگر اپنی
بہن ہو تو ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کر دیں مگر ان کا ماننا بھی مصیبت ہے۔ اچھی روحی
ذرا اس کے معنی بتا دو۔ ذرا یہ "ایسولا نے" لکھا ہے، پڑھ کر بتاؤ۔ ٹھیک ہے ———
چلو بازار میں شوپنگ کرنی ہے۔ میری جیسی سینڈل لو۔ کتنا اچھا معلوم ہوگا جب ہم
تینوں ساتھ چلیں گے یہ پہنے ہوئے۔ نظر لگ جائے گی۔ ٹانگہ کی گھنٹی بجی۔ یا اللہ ابھی تو
ساڑھی باندھی ہے کیا منہ بھی نہ دھوؤں۔ خود تو اس قدر میک اپ کر کے گئی ہیں کہ یا
اللہ ہم جب اسٹوڈنٹ تھے تو کبھی بھی کچھ نہ لگایا۔ اور اب بھی جی نہیں چاہتا۔ اور اوپر
سے خطاب ملا کہ جناب تو مردہ دل ہیں کیا ہم بھی اپنی نیچر چینج کرلیں۔ بس بھئی اللہ کس
قدر شریر لڑکی ہے بات بات میں انگریزی کی ٹانگ ٹوٹتی ہے۔ اب مجھے بھی برقعہ
اوڑھنا پڑے گا کیسی غضب کی لڑکیاں ہیں۔ کوٹھی تک منہ پر نقاب ڈالے سکڑی

ہوئی بیٹھی رہتی ہیں اور کوٹھی کی حد ختم ہو گئی اور نقاب ہوا میں لہرانے لگی ــــــ
روحی بھئی آؤ نا ــــــ میں نے جوڑا ختم کرتے ہوئے جلدی سے برقعہ اوڑھا
اور چل دی۔

روحی بی بی آپ آگے آ جائیں۔ مجید نے تانگہ کے بیلنس سے مجبور ہو کر
چیختے ہوئے کہا۔ نا بابا میں مر بھی جاؤں مگر آپ کے پاس کبھی بھی نہ بیٹھوں ــ
بالکل ایسے جیسے مشتری بائی کے تانگہ میں ان کے استاد جی کوچوان کو چلتے تانگہ
میں بیڑی جلا کر پیش کر رہے ہوں۔ اور اوپر سے تحفگی یہ کہ سیاہ برقعہ میں ملبوس
ایک محترمہ اگر میری طرح موٹی ہوئیں تو خدا کی پناہ ایک عدد گٹھری رکھی ہوئی ہے
جو تانگہ کے ہر ہچکولے پر گرنے کے خوف سے اِدھر اُدھر ہل جائے۔ فرحہ بی بی تم
بیٹھ جاؤ۔ تم چھوٹی سی تو ہو۔ جاؤ۔ نہیں روحی باجی آخر گھر میں سب سے چھوٹا ہونا
ہی غضب ہے کہ جب کچھ نہ بن پڑا تو فرحہ بی بی تم جاؤ۔ تم تو چھوٹی سی ہو۔ آخر میں
کہاں کی چھوٹی ہوں۔ حد ہے ایک دو سال آپ لوگوں سے چھوٹی ہوں، ہوں تو
پندرہ سال کی۔ آٹھویں پاس کر چکی ہوں۔ آخر میں کہاں سے چھوٹی رہی۔ کس قدر
باتیں کرتی ہے میں نے دل میں جل کر کہا۔ اچھا بھئی مجید اب تم ہی جانو۔ میں تو آگے
بیٹھنے سے رہی۔ رعنا بیگم سے تو کس کی مجال ہے جو ان سے کہا جائے۔ آپ
تشریف لے جائیں اور میں نے غصے میں ان کی طرف نظر ڈالی۔ کالے برقعہ میں

سے چمکتا ہوا سفید سرخ چہرہ جو ہنسی ضبط کرتے کرتے بے انتہا سرخ ہو گیا تھا۔ اور مصلحتاً دوسری طرف رخ کر لیا گیا تھا۔ برقعہ کے باہر نکلی ہوئی عنابی ربن والی زلفیں اب سفید ہاتھوں میں تھیں۔ آخر بیگم صاحب ہیں کیا خدا نہ کرے کسی کے چٹکی لے لیتا ہوں۔ مجید نے اپنی سفید مونچھوں کو سنوارتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ جان ہی تو جل گئی۔ اس موسم میں ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں کوٹھی مینہ سے گھری ہوئی تھی۔ گلاب کے بڑے بڑے کھلے ہوئے پھول میری کھڑکی میں جھانک جھانک کر شاید مجھے ڈھونڈ رہے تھے سرد ہوائیں میرے گرم گرم رخساروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ یہ ایسا اچھا موسم کالے ریشمیں برقعہ جسم سمیت آپس میں ٹکرا رہے تھے۔ نرم نرم گدے اور پھر تانگے کے میٹھے میٹھے ہچکولے۔ کاش کہ یہ سفر کبھی ختم ہی نہ ہو۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ مجید کے سخت جسم جیسا ایک بڑا سا پتھر اس کے پہلو میں رکھا تھا۔ ایسے اچھے موسم میں۔ آہ بڑھاپا۔ بیچارہ مجید اس کی چھدری چھدری سفید مونچھیں اور اس کی وہ مایوس نظریں۔ تبھی وہ بڑی بیگم صاحب کے حضور میں فرما چکے تھے۔ ناہیں بیگم صاحب ہم بچیوں کو لیجاوت ہیں۔ ہم سچ کہہ رہے ہیں ناک میں دم آجاوت ہے۔ آگے کوئی بیٹھنا ہی نا چاہے ہے —— بے چارہ مجید۔ ایک موہوم سی امید بھی ختم ہو جاتی ہے۔ جب تانگہ جوڑ کے لاتا ہے کہ کوئی بی بی میرے پاس بیٹھے گی۔ مگر یہ ظالم بیبیاں مرجانا گوارا کرتی ہیں مگر بیوقوف سے مجید کے پاس کبھی نہیں بیٹھتیں —— ایک ہچکولے کے ساتھ ہم اب

اسکول کی گلی میں تھے۔ بس بس ——— ارے بس۔ سنتا نہیں۔ ہم تینوں نے
چیخ کر کہا مگر وہ انتقام اب لینا چاہتا تھا۔ اجی گھوڑا جب ٹھہرے گا تو جبھی تو رکوں گا
وہ چودھری مونچھوں میں مسکرایا۔ اور رعنا بی رین زور زور سے مسلے جانے لگے احمق ہو
جی تم چغد چغد کہیں کا۔ اور رعنا کتابیں سنبھالتی ہوئی اتر بھی چکی تھی۔ روحی تم اب فرح
کو عربک اسکول میں لے جاؤ۔ خدا حافظ۔ ہرے رنگ کے گیٹ نے ہنستے ہوئے
سیاہ ریشم میں ملبوس جسم کو کھینچ لیا اور پھر سنجیدہ ہو گیا۔ جیسا کہ آج کل کے نقش قدم
پر چل رہا ہو ——— زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ۔ آخر تھا نا درسگاہ کا
دروازہ ———

ہلو روحی مس شرما نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا
اوہ روحی آج تم کہاں مس قریشی نے اپنے خاص انداز میں اپنی ساڑھی ٹھیک
کرتے ہوئے بڑی بڑی شوخ سی نگاہیں میری نگاہوں میں ڈال دیں۔ اور اپنی عادت
کے مطابق اپنے خم دار بالوں میں اپنی لمبی لمبی انگلیاں پھیرنے لگی ——— رفعت
آپا میں نے اپنی دلچسپ سی اُردو کی ٹیچر کو پکارا۔ اوہ روحی۔ ہوں کیوں اچھی تو ہو۔ اور
اپنی چھوٹی چھوٹی مگر چمکدار ذہین اور پھر اُداس چہرے سے دیکھنے لگیں ناک کا ایک سرا
اونچا تھا۔ وہ [illegible] بالکل وہی چیز تھی۔ مجھے بے اختیار یاد آ گیا۔ کتنا تنگ کرتی تھی
اپنی ان دلچسپ ٹیچر کو وہ [illegible] پڑھا رہی ہیں۔ اور بدقسمتی سے اس روز گھٹا چھا رہی
ہو [illegible] اپنے کلاس [illegible] کے پاس پہنچتی تھی۔ سب سے آگے ڈیسک ہوتا

تھا۔ مگر جب موڈ میں نہ ہوئی تو سب سے آخر میں کسی لڑکی سے چینج کر لیتی تھی۔ مگر پکڑی جاتی اور جواب طلب ہوتا۔ آپ نے اپنی سیٹ کیوں چینج کی ہے۔ میرے پاس جواب موجود ہوتا۔ میں اسٹیڈی کرنا چاہتی تھی اس لئے یہاں آبیٹھی آگے شور ہو رہا تھا۔ اور رف کاپی پر آن محترمہ کی تصویر بن رہی ہے بادل گرجے اور بوندیں پڑنے لگیں تو طبیعت زور پر آجاتی۔ شعر لکھے جا رہے ہیں کبھی کبھی چونک پڑتی۔ رفعت آپا کی توتلی آواز سے اچھا اب آپ لوگ (جو صاف نہ ہوتا تھا) وقت کی پابندی پر مضمون لکھیں۔ اور میری جان ہی تو جل جاتی۔ کہاں سے یہ مصیبت آجاتی ہے۔ بلائے ناگہانی بن کر مضمون لکھو وقت کی پابندی پر ——— اس پابندی وقت نے مجسم گھڑی بنا دیا ہے۔ ان کے چہرہ کو دیکھو کتنا فرق ہو گیا ہے پہلے اداس سا تھا۔ آنکھیں سوچ میں رہتی تھیں بار بار چونک پڑتی تھیں لڑکیوں کو وقت کی پابندی کا مضمون دے کر وہ اپنے دوپٹہ کے کروشیے کے تیار کئے ہوئے کناروں کو غور سے دیکھنے لگتیں جیسے کبھی دیکھے ہی نہیں کہ کیسے بنائے جاتے ہیں یا قلم کی نوک دانتوں میں دبا کے اپنے کسی چچازاد ماموں زاد بھائیوں کی تازی شرارتیں یاد کر رہی ہوں گی۔ جو پڑھانے میں شرما شرما کر اکثر دبے دبے لفظوں میں کہہ جاتی تھیں کہ روحی ہماری کلاس میں بڑی شریر لڑکی ہے۔ بالکل میرے ایک بھائی ہیں چچا کے لڑکے وہ بھی ایسی شرارت اکثر کرتے رہتے ہیں۔ اور جب میں پوچھتی رفعت آپا وہ آپ سے بڑے ہیں۔ وہ اپنی چمکدار چھوٹی چھوٹی نگاہیں میری نگاہوں میں ڈالکر دل ہی دل میں کہتیں تم اصل بات پوچھنا چاہتی ہو۔ اور سرخ

سرخ رخسار پر ہلکے ہلکے چپت لگاتے ہوئے ذرا سیریس ہو کر ہاں دو تین سال بڑے ہیں
ہم سب ساتھ ہی کھیلے ہیں۔ اور میں ان کے سرخ چہرے کو دیکھنے لگتی۔ مگر پھر غصہ آتا
خود تو اپنے ان کی شرارتوں کا لطف آنکھیں بند کر کے کرسی پر سر ڈال کر اٹھاتی رہتی ہیں۔ اور
ہم لکھیں ایسے اچھے موسم میں وقت کی پابندی پر مضمون۔ مگر جب سامنے ہی کلاس پر نظر
پڑتی تو سب کے سر جھکے ہوئے۔ اور ہاتھ ہلتے ہوئے نظر آتے۔ میں اپنا نڈھال جسم تنگ
آکر ڈیسک پر ڈال دیتی اور ہوا کی خنکی میں بھینی خوشبو مل کر تھپک تھپک کر سلا دینے پر مجبور
کر دیتی۔ روحی، روحی، عقیلہ اپنے موٹے موٹے نرم نرم ہاتھوں سے مجھے تھپک تھپک کر
اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اف لڑکی ذرا یہ مضمون پورا کر دو۔ اور آگے نہیں
لکھا جاتا۔ بھئی ہم سے اس وقت نہیں لکھا جاتا۔ ذرا بھئی رفعت آپا کی طرف تو دیکھو
کیا مزے سے ٹانگیں ہلا رہی ہیں اور نگاہیں گھٹا آلود آسمان پر لگی ہوئی ہیں کسی کی یاد
میں آنسو جھلملا رہے ہیں۔ اور میں نے کھسیانے ہو کر منہ چڑا دیا بڑی ٹیچر بننے چلی ہیں
خود کو تو اپنے اوپر کنٹرول نہیں اور سبق پڑھانے چلی ہیں۔ اپنی جیسی مجبور لڑکیوں کو، خود
وقت کھو رہی ہیں فضول خیالی محل بنا بنا کر بارش میں بہا رہی ہیں۔ اور ہم کو حکم دیا گیا کہ
وقت کی پابندی پر مضمون لکھو بھئی عقیلہ میں نہیں لکھتی ـــــــ اگلے ٹیسٹ میں
یہی مضمون لکھوایا تھا۔ ایک ہی سیڑھی پر بار بار چڑھو۔ میں تو نہیں لکھتی۔ ایسی بیوقوف
ہیں۔ آج اتنا اچھا موسم ہے اسی پر لکھواتیں، کہنے کو دسویں میں پڑھتی ہیں مگر مضمون
لکھیں پانچویں کلاس کے۔ ان کے دماغ میں رکھا کیا ہے۔ سوائے نئی نئی صورتوں

کے مزے دار باتوں کے جو اپنے تک ہی محدود رکھیں۔ میرا فلاں کزن ایسا ہے
فلاں ایسا ہے بھاڑ میں جائیں یہ کزن جس لڑکی سے سنو آج میرے کزن نے
فلاں کتاب لاکر دی بڑی اچھی ہے۔ ہم کل فلاں لیکچر میں گئے تھے بھئی خدا گواہ ہے
بڑی اچھی لیکچر ہے۔ کسی نے پوچھا کون کون گیا تھا۔ جواب کچھ شرما کر ملا امی کی طبیعت
خراب تھی۔ میں میری چھوٹی بہن اور ایک کزن ہیں ان کے ساتھ گئے۔ ہائے ردی
مجھے تم بے اختیار یاد آ گئیں ہیروئن اس قدر خوبصورت تھی کہ پکچر ختم ہو گئی مگر اس
کی شکل نظروں کے سامنے پھر رہی تھی۔ اور تمہاری فیوریٹ نرملا کے گانے تھے بیک
گراونڈ، رفتہ رفتہ سب کی صورتیں دھندلی ہو جاتیں اور نرملا اپنی بڑی بڑی آنکھیں
مٹکا مٹکا کر گردن ہلا ہلا کر گاتی ہوئی سامنے پھرنے لگی۔ "آمورے سیاں ڈوڈا ڈا۔ آمورے
سیاں ہو ہو جیا کل پائے، چین نہ آئے۔ کتنا درد کتنی معصوم سی آواز ہے ہائے اللہ
میرے منہ سے بے اختیار نکلا ——— ٹن ٹن گھنٹی بجی۔ پریر کا وقت ہو گیا تھا۔
سب کے سر ڈھک گئے۔ اور معصوم سے چہرے۔ بڑی بڑی نشیلی نشیلی۔ لمبی لمبی سیاہ
پلکیں صاف سی زمین میں کچھ ڈھونڈنے لگیں ———
گیلے گیلے سرخ سرخ سے لب۔ تھر تھرانے لگے۔ یہ عربک سکول ہے۔ بسم اللہ سے دعا
شروع ہوئی۔ الفاظ سمجھ میں نہ آتے تھے اور ایک قسم کی ہمنگ سی تھی۔ گویا ہر لب
دوسرے لبوں کے محتاج تھے سہارا ڈھونڈ رہے تھے الفاظ کا ——— میں
نے نظر چرا کر ادھر کی طرف دیکھا۔ غریب سب کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ فراسیس

سکول میں ایسی دعا تو کبھی بھی نہ ہوئی۔ تراشے ہوئے بال۔ دو چوٹیوں کی صورت میں باندھے ہوئے بال۔ ساڑھیوں اور فراکوں میں ملبوس خوبصورت جسم۔ شگفتہ چہرہ مگر یہ کیا بات تھی کہ ہر خوبصورت لڑکی کی آنکھوں کے گرد یہ سیاہ سے حلقے کیوں پڑے ہوئے تھے۔ خشک۔ سُرخ گیلے کانپتے لب اور God save the King. کانپتی ہوئی حلق سے نکلی ہوئی آوازیں۔

[illegible]

اس کمرے میں مسز بیچ بیٹھی ہیں۔ بوڑھی چپراسن نے انگلی سے بتاتے ہوئے خوف سے اُدھر دیکھا اور دبے قدموں سے انگنائی سے باہر نکل گئی اور سامنے کے دروازے سے پھر اسکول میں چلی گئی۔ کمرے میں سے چمچوں کی شیشے کی پیالیوں سے ٹکرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک قسم کی جھنجھناہٹ سی۔ جس کو سن کر گرم گرم خوشبودار چائے کی پیالیاں۔ آملیٹ۔ ٹوسٹ وغیرہ نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ اور پھر صبح سے کچھ نہ کھانے کے بعد یہاں تک کہ دس بج گئے تھے اسکول صبح ساڑھے سات بجے لگتا تھا۔ اور ہم کو انتظار کرتے کرتے دس بج کر بیس منٹ ہو گئے اور ہمارے منہ میں کھیل تک نہ گئی باز آئی ایسے پڑھنے سے فرحہ نے مُنہ بسورتے ہوئے کہا اور مسز بیچ کو دل ہی دل میں کوستے ہوئے آنکھوں کے آنسو جذب کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مسز بیچ کی انگنائی کا معائنہ کرنے لگی۔ غریب فرحہ میں نے دل ہی دل میں اس کی معصوم شکل دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر آخر وہ غریب

کیسے ہوئی۔ میں بھی تو اس وقت غریب بیچاری تھی معصوم۔ میں نے کونسا ناشتہ کرلیا۔ بیرا' میں نے کمرے سے نکلتے ہوئے بیرے کو آہستہ سے آواز دی اور وہ مسکراتا ہوا آیا۔ جی' اس نے اپنی پگڑی درست کرتے ہوئے کہا۔ ذرا مسز بیچ کو کہدو کہ ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آل رائٹ اس نے ہم سے بے تکلفی کا اظہار کرتے ہوئے تیز تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور کمرے میں مٹکتا ہوا چلا گیا۔ کمرے کا پردہ ہوا میں اڑا اور کمرے کا ایک حصہ نظر آیا۔ مسز بیچ کی آدھی کمر نظر آئی تو میں نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے فرحہ کو اشارہ کیا۔ کم بخت کرسی میں پھنسی پڑی ہے۔ لال نائٹ بلاوز میں سے کالے موٹے موٹے بازو۔ اور نیلی ساڑھی اور بلاوز کے درمیان سے سیاہ ابھری ہوئی کمر نظر آرہی تھی۔ کالے کتے کی کمر پر موٹے موٹے کالے کالے ہاتھ محبت سے پھیرتے ہوئے نظر آجاتے تھے اور اس آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ جب تیسری دفعہ ہم نے انتظار کرتے کرتے بیرے کو بھیجا تھا۔ اس وقت گیارہ بجنے میں سولہ منٹ رہ گئے تھے۔ حیرت تھی۔ اتنے موٹے جسم میں سے ایک باریک مگر تیز سی آواز سنائی دی ان کو بولدو۔ ہم نے ایک بار بول دیا ہے۔ ہم ابھی چائے پیتا ہے۔ ہم بزی ہے۔ فضول بات نہیں سننا مانگتا۔ کہدو ان لوگ کو کہ ہمارا گھر سے چلا جائے۔ ہم جب اسکول آئے گا۔ تب ہم سے بات کرنا۔ الو باجی جاؤ۔ کون نے کنڈا کھولا تھا۔ جاؤ ان کو کہ لو چلے جائیں کوئی مرد نہ ہوتا تو اس بگڑی ہیم کو ایسا ٹھیک کرتی کہ یاد کرتی مگر جل بھن کر رہ گئی فرحہ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ غریب بچی۔ مگر میں نے بھی اونچی آوازیں

کہدیا کہ اس ادارے کے عجیب ممبر ہیں جو ایک مسلمان اسکول کی کالی سی بدذوق چڑیل سی عیسائی پرنسپل رکھی ہے۔ جو سیدھے منہ بات کرنی ہی نہیں جانتی۔ کم بخت اب کبھی نہیں آئیں گے تیرے اسکول میں۔ فرحہ نے بھی جل کر ذرا آہستہ سے کہا اور کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے ہم لوگ باہر تھے ٹانگہ میں بیٹھ کر میں نے نقاب ڈال لی اور جلنا رو دیا گیا خوب روئی اس دنیا میں کیسے ذلیل لوگ رہتے ہیں۔ کتوں سے زیادہ ذلیل جو کتے اور آدمی میں فرق نہ سمجھیں اور میں ضبط نہ کرسکی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ہائے روحی باجی فرحہ نے اپنی آنسوؤں سے لبریز نگاہوں سے میری نقاب کے اندر جھانکتے ہوئے دیکھا۔ اور خود بھی روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔ جیسے میں بیوہ ہوگئی ہوں اور میری چھوٹی بہن کسی دوسرے شہر سے آکر صدمے کی تاب نہ لاکر ٹانگے ہی میں لپٹ کر پرسہ دے رہی ہو ——— اور مجید نے اپنی چھدری چھدری مونچھوں سے پیلے پیلے سرخ دانت نکالتے ہوئے گھبراہٹ میں پوچھا۔ اے بیٹا کیا ہوگیا۔ دشمنوں کی طبیعت کیسی ہے۔ کیا گر پڑیں ——— اور میں جل بھن کر چپ ہوگئی ——— اور میں سوچتی رہی کہ نہ جانے صبح کس کا منہ دیکھا تھا؟ ———

شمیم اپنی ذرا یہ کپڑے دھو لینا۔ شمیم نے گھڑی کی طرف اپنی مخمور نگاہیں ڈالتے ہوئے سست لہجے میں کہا۔ اچھا! بیگم صاحبہ اس کا دل بھی گھڑی کی ہلکی آواز کا ساتھ دے رہا تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ مگر شمیم اپنے تھکے ہوئے قدموں کو آہستہ آہستہ اٹھانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ـــــ کمرے سے باہر تھی ـــــ

اس کے بازو شل ہو چکے تھے۔ نازک انگلیاں سرخ ہو چکی تھیں ـــ رسّی تقریباً کپڑوں سے پُر ہو چکی تھی ـــــ ٹھنڈی ٹھنڈی مدہوش و مست ہوا کے جھونکے اس کو کہیں اور لے جانا چاہتے تھے ـــــ بندھے ہوئے بال اب اس کے رخساروں کو محبت سے بار بار پیار کر رہے تھے ـــ صحن

میں چاروں طرف چاند کی اداس چاندنی پھیلی ہوئی تھی —— کمروں سے سکون کی نیند میں مدہوش تیز تیز سانسوں کی آواز بار بار شمیم کو چونکا دیتی تھی۔

وہ اس وقت بالکل تنہا تھی —— اس کا ساتھی اس وقت وہی تھا —— وہ جسے —— وہ دیوتا تصور کرتی تھی —— سچ بھی تو تھا —— اس دنیا میں اس کا ساتھی ایک بڑا سیاہ پتھر تھا —— جس پر وہ اس وقت تھک کر بیٹھ گئی تھی —— وہ اس سے بہت مانوس تھی —— یا پھر وہی —— اس کے تخیلات کی دنیا کا مالک —— وہ گھنٹوں —— اسی خیال میں کھوئی رہتی تھی —— کیا وہ —— وہاں تک پہنچ سکتی ہے —— وہ سوچتی۔ —— کیا وہ دنیا بھی اتنی سنگدل ہے —— نہیں —— کبھی نہیں —— وہ دنیا معصوم و پاکیزہ نظر آتی ہے —— وہ دیکھتے دیکھتے تھک جاتی اور اس کی اداس آنکھیں —— ناامیدی سے اس سیاہ پتھر پر جم جاتیں —— اس کی اس معصوم ادا پر ننھے ننھے شوخ چمکتے ہوئے ستارے بھی تڑپ جاتے —— کیا وہ اس کی مدد کر سکتے تھے —— کیا ان میں بھی دکھاوٹ کی رنگینی تھی —— اس کا دماغ چکرانے لگتا اور بے اختیار اس کی نازک انگلیاں سیاہ پتھر پر التفات کی منزلیں گننے لگتیں۔

وہ چونک پڑی —— کیا —— وہ کہاں ہے —— اس کی

حسین و معصوم دنیا ـــــ جس میں وہ ابھی ابھی سرگرداں تھی ـــــ وہ کتنی مسرور تھی ـــــ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں نہ جانے کیسے پر نم ہو گئی تھیں ـــــ اس کا سفید پاکیزہ چہرہ نہ جانے کیوں سرد ہو گیا تھا ـــــ شاید نسب کی دیوی اپنے منتشر بالوں کو سنوارتے ہوئے اس کے قریب سے گذری ہو ـــــ اس کی شفاف چمکتی ہوئی پیشانی کو شاید محبت سے چوما ہو ـــــ اور سحر شوخ کی آمد کی خبر پاتے ہی شاید گھبراہٹ میں اس کی نازک مالانہ ٹوٹ گئی ہو جس کے ـــــ کئی چمکدار موتی اب تک اس کی پاکیزہ پیشانی اور سیاہ بالوں پر چمک رہے تھے ـــــ کیا وہ پھر ایسا ہی پر سکون حسین خواب دیکھ سکتی ہے ـــــ مگر نہیں ـــــ وہ پھر اسی رنگیلی دنیا میں آ گئی تھی ـــــ جس کی ہر رنگین تصویر ـــــ مصور کا شاہ کار تھی ـــــ مگر کاغذ پر ـــــ صرف دھوکا تھا۔ وہ اس دنیا سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ ـــــ اس دکھاوٹ کی دنیا سے جس کی بنیادیں صرف دھوکے کی رنگین دیواروں پر رکھی گئی تھیں ـــــ کیا وہ ان رنگین نقوش پر اعتماد کر سکتی تھی جو کہ محلوں کے شاندار ستونوں پر بنائے جاتے ہیں ـــــ اور پھر برسات کے بعد دوبارہ رنگ پھیرا جاتا ہے ـــــ کبھی نہیں ـــــ آہ اس کی معصوم دنیا ـــــ مگر وہ تو اپنی اسی جگہ پر بیٹھی تھی ـــــ وہی سیاہ پتھر ـــــ اس کا

ساتھی اب رخصت ہونے والا تھا ـــــــ اس کی اُداس نگاہیں اپنے حسین مصور کے دلکش زندہ شاہکار کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتی تھیں ـــــ مگر اس کا پریشان چہرہ ہوا کے سرد تیز جھونکوں سے سیاہ بادلوں میں پوشیدہ ہو گیا ـــــــ

آج وہ کتنی تھکن محسوس کر رہی تھی ـــــــ مگر مالک کی خوشی کا صحیح راز یہی تھا ـــــــ وہ کتنی مغموم تھی۔

دنیا، حسن، غرور، محبت، نفرت، سب سے مانوس تھی ـــــــ اس کو سب سے نفرت تھی ـــــــ اس کے ہاتھ میں سالن کی بھری ہوئی رکابیاں تھیں۔ وہ دھولے رہی تھی ـــــــ قریب کے کمرے سے مسرت سے پُر قہقہے ـــــــ ہوا کی مدد سے اس کے کانوں تک پہنچ رہے تھے ـــــــ وہ تو آج تک اتنا نہ ہنسی ہو گی ـــــــ کیوں نہ ہنسی! وہ خود بھی آگے نہ سوچ سکی ـــــــ

برتن کافی دھل چکے تھے ـــــــ دو ایک باقی تھے ـــــــ سامنے ٹوکرے میں رکھے ہوئے برتن اب کیسے چمک رہے تھے کیونکہ وہ دھل چکے تھے ـــــــ اور نازک پاک انگلیوں سے صاف کئے گئے تھے اس نے ایک رکابی کو صاف کرتے ہوئے منھ کے قریب لا کر سونگھا اب اس میں بو نہ تھی ـــــــ یکایک اس کو اپنی شکل چمکتی ہوئی

رکابی میں نظر آئی۔ انسان کی زندگی سے کتنی ملتی جلتی تصویر تھی۔ جب انسان کو گناہ کرتے کرتے ہوش آتا ہے تو اس کی حالت سالن کی بھری ہوئی رکابی جیسی ہوتی ہے۔ جس میں سے بو آنے لگتی ہے۔ لیکن جب اس کو پاکیزہ ہاتھوں سے دھویا جائے۔ تو اس کی گندگی ایک نالی میں یا برتن دھونے کے تسلے میں جمع ہو جاتی ہے۔ اور دھل کر انسان کا ظاہر و باطن صاف نظر آجاتا ہے جس میں سے ہم اپنی دلی کیفیت کو خود دیکھ سکتے ہیں۔ کاش کہ ایسا ہو ——— دو ایک برتن باقی رہ گئے تھے ———

سامنے پھولوں کی کیاریوں میں سے دو مرغیاں آپس میں لڑتی ہوئی نکلیں ایک بہت موٹی اور خوبصورت تھی شاید وہ مالک تھی ——— ان میں بھی مالک و آقا کا امتیاز رکھا جاتا ہے کیا یہ حقیقت ہے؟ ——— کالی بڑی تو مرغی اٹھلاتی ہوئی ——— غرور سے قدم اٹھاتی ہوئی آرہی تھی ——— کمزور چھوٹی مرغی پیچھے پیچھے تھی ——— گھاس پر آکر رک گئی ——— بالکل اسی طرح جس طرح شمیم کی بیگم سیر کرنے کے لئے جاتے وقت اس کو اپنی چیزیں دینے کے لئے رک جاتی تھیں ———

دنیا ——— کیا ان جانوروں میں بھی اس چیز کا امتیاز رکھنا پڑتا ہے ——— بڑی مرغی نے شان سے پیچھے مڑ کر دیکھا ——— غریب سدھی ہوئی مرغی اشارے کو سمجھ گئی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے خوبصورت مرغی

کے چمکیلے پروں سے کھیل رہے تھے۔ اور کمزور مرغی باریک سی چونچ سے اس کی کھال کو کھجا رہی تھی۔ نرم نرم ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس کی ٹھنڈک پنجوں کے ذریعہ اس کے دماغ میں ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔

جھاڑیوں میں حرکت ہوئی اور دو لڑکے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے آئے۔ ایک کے گلے میں رسّی تھی اور دوسرا رسّی کو پکڑے ہوئے ایک لکڑی سے مارتا ہوا آرہا تھا ——— شمیم کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ آہ میرا بھیا۔ وہ چیخ پڑی۔ اسلم بھیا کیوں مارتے ہو ——— چپ رہو جی ہم گھوڑا گھوڑا کھیل رہے ہیں ——— چل ناصر ——— ناصر لکڑی کے پڑنے ہی بھاگنا چاہتا تھا ——— مگر قدم زمین پر تھے ——— اور التجا بھری نگاہیں شمیم پر ——— غریب بہن کیا کر سکتی تھی ——— اس کا یتیم معصوم بھائی اس کے جگر کا ٹکڑا تھا ——— مگر آہ وہ نوکر تھا۔ اور وہ آقا ——— ایک، دو، تین، تیسری لکڑی پر ناصر بے تحاشا بھاگتا ہوا نظروں سے غائب تھا ——— نازک نازک جھاڑیاں اب تک لرز رہی تھیں۔ معصوم کلیاں ——— اپنے جیسے معصوم پر ظلم ہوتے دیکھ کر پتوں میں منہ چھپا کر ——— بارگاہ ربی میں دعا مانگ رہی تھیں، سامنے دونوں مرغیاں بھی غائب تھیں۔ تیز ہوا کے جھونکے ——— بدن میں کپکپی پیدا کر رہے تھے ———

شمیم کے ہاتھ کانپ رہے تھے ـــــــ دفعتہً میلے پانی جس پر چکنائی کی تہہ جمی ہوئی تھی ـــــــ دو سفید پانی کے قطرے گرے شمیم چونک پڑا بھی یہ کیا آنسو ـــــــ مگر آہ ان کی کوئی قیمت نہ تھی پانی کے قطروں سے چکنائی کی تہہ پر ذرا سی حرکت ہوئی اور وہ پھر ویسی ہی جم گئی آہ کیونکہ وہ بھی تو ایک غریب یتیم اور نوکر کے آنسو تھے ـــــــ کمرے سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں ـــــــ دوسری طرف گراونڈ میں کسی کے رونے کی آواز آ رہی تھی ـــــــ شاید وہ ناصر تھا ....

گولیاں

دیکھو بابا گولیاں ۔۔۔۔۔۔ ہاہا ـــــ گولیاں ۔۔۔۔۔۔ میرا لال
کھیلا کرتا تھا ان ننھی ننھی مٹی کی گولیوں سے۔ میرا سلیم ـــــ میرا بچہ
۔۔۔۔۔ ہاہا۔۔۔۔ گوری گوری ننھی ننھی ہتھیلیوں پر رکھ کر بھاگا، بھاگا
۔۔۔۔۔ میرے پاس آتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ دیکھئے۔۔۔۔ ایسی۔۔۔۔
گولیاں ـــــ میرا سلیم ـــــ وہ دیوانوں کی طرح قہقہے لگا رہی تھی ـــ
نرم نرم قالین پر مٹی میں بھرے ہوئے پیر۔ پیلی ہتھیلی پر ننھی ننھی مٹی کی گولیاں
کانپتے ہوئے ہاتھ پر آپس میں گلے مل رہی تھیں ۔۔۔۔۔۔ سفید سر کا رُخ
مٹی میں بھرے پیروں کی طرف تھا۔۔۔۔۔ عینک کے دائروں میں سے
جھانکتی ہوئی۔ بے نور سی آنکھیں اُن نرم و نازک پیروں کی۔ نزاکت

پر غور کر رہی تھیں۔ یہ پیر پہلے پہل اس وقت اُس نے دیکھے تھے۔ جب وہ تھکا ہارا ریل کا سفر طے کر کے اپنے کمرے میں گھسا تھا۔ ۔ ۔ ۔ جہاں صرف عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پلنگ پر سے سفید کپڑے کو اٹھایا تھا ــــــ جس میں سے پہلی دفعہ ننھے سرخ چھوٹی چھوٹی انگلیوں والے پیر نظر آئے تھے۔ ان پیروں کی اس نے کتنی حفاظت کی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مٹی میں بھرے ہوئے پیروں نے اکثر اس کے سفید اجلے کپڑوں کو بھی میلا کیا تھا ــــــ پھر ایک روز یہی پیر بڑے اور خوبصورت ہو گئے تھے۔ اس کے وہ پیر بہت بھاری لگتے تھے، بہت بھاری ــــــ مگر وہ اُن بھاری پیروں کو بدستور اٹھائے ہوئے تھا۔ کیونکہ وہ ڈرتا تھا، خوفناک تنہائی سے۔ ان ہی پیروں کی بدولت جب وہ پہلے پہل دنیا میں آئے تھے اس کی زندگی کا سہارا دنیا سے اٹھ گیا تھا ــــــ قدرت نے اسے ننھے ننھے دو پیر دیئے تھے تسکین تو خیر ہو گئی تھی اُسے، اس کی ٹھوس زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا۔ جیسے وہ ننھے ننھے پیروں سے پُر کرنا چاہتا تھا ــــــ

اب وہ خلا پُر ہو گیا تھا ــــــ گھر بار۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دنیا والے اُسی پر ہنستے تھے۔ اس کا دھڑکتا ہوا دل۔ کسی بوجھ سے دبتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل کی دھڑکنوں میں اب کوئی

حائل ہوگیا تھا۔ جس سے رفتار سست ہوگئی تھی۔ اس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اتنے کمزور کہ وہ بوجھل پیروں کو نہ اٹھا سکتے تھے۔ ان کا بوجھ اب کسی مضبوط بازوؤں کو اٹھانا چاہیئے۔ اسی خیال سے وہ کانپ جاتا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کا سیاہ سر بالکل سفید ہوگیا تھا ـــــــ آخر ایک روز وہ بوجھل پیر سفید نرم و نازک سے ہوگئے سفید پیر مہندی سے سرخ کئے گئے ـــــــ مگر اس کے کمرے ویران ہوگئے۔ سنسان سی کوٹھی میں اس کا دم نکلنے لگا۔ مدت تک اس کے کانوں میں دور کہیں قہقہے گونجتے رہے۔ اس کی زندگی پر سیاہ تاریکی کے پردے پڑ گئے۔ ماضی کے ہچکولوں سے پیروں میں جنبش ہوتی اور سیاہ تاریکی میں باریک سا خلا نمودار ہوجاتا اس خلا میں کبھی ننھے ننھے پیر سرخ سے سفید کپڑے میں سے جھانکتے نظر آتے۔ کبھی لکڑی کے رنگین گڈولنے کے ساتھ ساتھ اٹھتے ہوئے گوشت سے ابھرے ہوئے۔ پھر وہ کتنے بوجھل ہوگئے تھے۔ دنیا اس پر ہنستی تھی شاید وہ اس کی پرسکون زندگی نہ دیکھ سکیں۔ اس سوچ میں سیاہ سر سفید اور سفید پیر رنگین ہوگئے ـــــــ مگر کچھ ہی مدت بعد مضبوط بازو رنگین پیروں کو نہ اٹھا سکے دنیا کی نظر لگ گئی ـــــــ قدرت نے مضبوط بازو ہمیشہ

ہمیشہ کے لئے چھین لئے ـــــ سفید سر اب جھک گیا ـــــ
سرخ رنگین پیروں کی مہندی اب پھیکی پڑ گئی تھی ـــــ کمروں میں
اب سیاہ پردے پڑ گئے تھے۔ شام کو اکثر پردوں کے پیچھے سے سسکیوں
کی آوازیں تھرتھراتی ہوئی چھت سے ٹکرا جاتیں ـــــ سفید سر
بھی جھک جاتا۔ کھردرے جھریوں دار رخساروں پر آنسو بہنے لگتے۔ مگر
اب اس کا دل نہ گھبراتا۔ سیاہ پردوں میں جنبش ہوتی اور زرد کمھلایا
ہوا پریشان بالوں میں سے جھانکتا ہوا چہرہ نظر آجاتا۔ بابا ......
ہونٹ کانپتے اور...... زرد سے رخساروں پر آنسو بہنے لگتے.....
اس چہرے کے ساتھ ہی ایک سرخ و سفید معصوم سا چہرہ سفید سر
کو دیکھ کر بے اختیار کھِل اٹھتا گیلے گیلے سرخ ہونٹ گول سا دائرہ
بنا لیتے ـــــ ننھے ننھے گول گول ہاتھ، سرخ سرخ چھوٹے چھوٹے
پیر سفید سر کی طرف بے اختیار بڑھ جاتے ـــــ زرد چہرہ کھِل
جاتا۔ بابا........ سلیم کو لے لیجئے .... کمزور سے بازو ننھے
سے سلیم کو بھینچنے کی کوشش کرتے۔ مگر قدرت نے ان کمزور سے
بازوؤں سے بھی ننھا سا پھول چھین لیا ـــــ زرد چہرہ اب کبھی
بھی نہ کھلتا اس کی مسکراہٹیں سیاہ کپڑوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
پوشیدہ ہو گئیں۔ نہ جانے وہ اب نیلے نیلے چمکیلے آسمان کو گھنٹوں کیوں

گھورتی رہتی۔ گیلی گیلی نرم ابھری ہوئی مٹی۔ جو زمین کی سطح پر کبھی اُبھر
آتی تھی۔ پھولی ہوئی۔ جیسے کسی دیوار پر برسوں سے سفیدی نہ ہوئی ہو۔
اور مسلسل بارش کے بعد دھوپ نکلنے پر گرمی سے چونے کی باریک
باریک سی تہیں کیسی الگ سے گر پڑتی ہیں۔ اس کا اب یہی مشغلہ تھا۔
چپکے سے سب کی نظروں سے اوجھل ہوئی اور سیدھے باغیچہ کی میلی کچیلی
دیواروں کی میلی سیاہ سی سفیدی کو جو اب سفیدی سے سیاہ ہو گئی
تھی۔ بجلی کے بجلی اپنے لمبے لمبے ناخونوں سے کھرچنے لگتی ــــــ جب
اس نے لمبے چوڑے باغیچے کی سیاہ سی سیلی ہوئی دیواروں کو ــــ
جن پر کئی قسم کی پھپھوندی سی لگ گئی تھی ــــــــ سیاہ سی دیواریں
اب لال لال اینٹوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ گیلی گیلی ٹھنڈی سی سرخ
سرخ کھردری سی اینٹیں۔ وہ اپنی لمبی لمبی پیلی پیلی کانپتی ہوئی انگلیاں
پھیر رہی تھی۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس کا جی چاہا کہ دانت سے
توڑ لے۔ ایک سرخ سی اینٹ کا کنارہ۔ مگر بڑی سخت تھی اینٹ۔
نہ جانے اس کا دل اندر سے کیوں مچلنے لگا۔ جیسے کوئی چیز گھبرا گھبرا کر
پھڑپھڑا رہی ہو۔ آخر اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے چپکے سے گیلی
گیلی کھردری سرخ سرخ سی اینٹ پر اپنی بھیگی ہوئی زبان پھیر ہی دی۔
اس کے ہونٹ چھل گئے مگر منہ میں بے حد پانی جمع ہو گیا تھا ــــ

کتنا اچھا مزا تھا ـــــــ وہ اپنے منہ کا پانی حلق کے نیچے اتارنے لگی۔
نہ جانے اس کو ایسا کرنے میں کیا مزا آتا تھا ـــــــ باغیچے میں وہ
چپکے سے چلی جاتی ـــــــ کیاریوں کے کنارے مٹی میں اپنے گرم
گرم جلتے ہوئے پیر دبائے گھنٹوں بیٹھی رہتی ـــــــ سوکھی سوکھی مٹی
کی گول گول گولیوں کو وہ اپنی لمبی لمبی کمزور سی انگلیوں میں دباکر زور سے
بھینچ دیتی۔ گھنٹوں اسی سوکھی سی مٹی کو مسلتی رہتی۔ جبتک وہ پاؤڈر کی
صورت میں نہ ہو جاتی۔ وہ مسلتی رہتی۔ کیاریوں میں ٹھہرے ہوئے پانی کا
چلّو بھر کے اس مٹی پر ڈالتی۔ کتنی اچھی سوندھی سوندھی سی خوشبو آتی تھی۔
وہ دیوانی سی ہو جاتی تھی۔ خود بخود بولنے لگتی۔ بیوقوفوں کی طرح ہنسنے لگتی،
گیلی گیلی مٹی اٹھا اٹھا کر درختوں پر بیٹھی ہوئی چڑیوں پر پھینکتی۔ نرم نرم
گیلی گیلی ٹھنڈی ٹھنڈی مٹی پر کپڑوں سمیت لیٹ جاتی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی
مٹی اٹھا کر اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر لگاتی۔ اس وقت اس کا چہرہ کتنا
زرد پڑ جاتا تھا۔ خشک پھیکے پھیکے سے ہونٹ کانپنے لگتے۔ زرد مرجھائے
ہوئے رخساروں پر آنسو بہنے لگتے۔ پاگلوں کی طرح سے وہ نیلے
نیلے چمکیلے آسمان کو گھورنے لگتی۔ جہاں اس کا بوجھ اٹھانے والے مضبوط
بازوؤں کی طاقت جذب ہو گئی تھی۔ اسی طاقت کے بارے میں اس
نیلے نیلے آسمان نے اسے کیا دیا تھا ـــــــ کالی کالی سیاہ راتیں،

سنسان سے دن۔ وہ جدھر دیکھتی سیاہی سیاہی ہی آ سے گھیرے رہتی۔ نیلے نیلے پردے کے پیچھے اس کا سکون اس کی نیندیں اس کا سکھ اس کی زندگی ـــــــ اس کی امیدیں جس کے سہارے وہ دوبارہ جینا چاہتی تھی ـــــــ چھوٹا سا معصوم سلیم۔ وہ بھی مضبوط بازوؤں میں کھنچا چلا گیا ـــــــ اب کیا تھا اس کا اس سیاہ سی دنیا میں ایک سفید سر۔ جس کے سائے میں اس نے بچپن گذارا۔ لڑکپن گذارا پھر اب جوانی بھی کچھ گذر چکی ـــــــ اس نے الگ راہ اختیار کی لیکن فطرت کو شاید ذرا بھی نہ بھائی وہ راہ۔ آخر پھر اس سفید سر کے سائے میں وہ سیاہ لباس میں ملبوس دو جانوں کا صدمہ اپنے سینے میں چھپائے ـــــــ اس مٹی سے کھیلتی رہے گی ـــــــ جس میں اس کی زندگی کی دو تصویریں پوشیدہ ہو گئیں ـــــــ

نرم گیلی مٹی پر لیٹے لیٹے۔ اپنی لمبی کمزور سی انگلیوں سے سوندھی مٹی کھودنے لگتی ـــــــ نہ جانے کیا سوچتے سوچتے وہ آنسو بہانے لگتی ـــــــ ہونٹ آہستہ آہستہ ہلتے۔ چہرہ سرخ ہو جاتا ـــــــ تیزی سے مٹی کھودنے لگتی ـــــــ کھودتے کھودتے ایک ننھا سا گڑھا کھود لیتی ـــــــ اسی میں پاؤں پھیلا کر۔ چمکتے ہوئے سورج کو۔ دیر تک دیکھتی رہتی۔ مرجھایا ہوا چہرہ سرخ ہو جاتا سوکھے ہوئے

ہونٹ کانپنے لگتے۔ پسینے کی بوندیں ماتھے پر چمکنے لگتیں ہاتھ پیر ڈھیلے
سے ہو جاتے۔ نہ جانے کیا سوچتی رہتی۔ چھوٹی چھوٹی نڈر چڑیاں بھی تو اس کو
چپکا بیٹھا نہ دیکھ سکتی تھیں۔ اس کے الجھے ہوئے بالوں میں اُلجھتے
ہوئے۔ تنکے۔ روئی۔ سوکھے ہوئے پتے اور نہ جانے کیا کیا اس
کے پریشان بالوں میں پھینک جاتیں ——— اس ہی پر کیا منحصر
آٹھ نو بل کر۔ اس کے چاروں طرف اُڑتے ہوئے خوب چہچہتیں
اتنا شور کرتیں کہ وہ بیزار سی ہو کر ان کے پیچھے بھاگتی۔ اور گیلی گیلی
مٹی مٹھیوں میں سے کر ان پر پھینکتی۔ مگر وہ ننھی ننھی جانیں۔ دھڑکتے
ہوئے دل سے کر۔ اپنی فتح کی خوشی میں چوں چوں کرتی ہوئی، آسمانی
فضاؤں میں بہتی چلی جاتیں دور بہت دور۔ نرم سفید سفید۔ بادلوں میں
کالے کالے دھبے غائب ہو جاتے۔ وہ دیر تک ٹکٹکی باندھے
انہیں دیکھتی رہتی۔ حسرت بھری نگاہوں سے۔ شاید اس کا دل
بھی چاہتا ہو۔ کہ میں بھی ایسی ہی اُڑتی ——— مگر وہ جھنجھلا کر اپنا
مشغلہ شروع کر دیتی۔ کھودے ہوئے گڑھے میں کھلے ہوئے پھول
ہری ہری ٹہنیاں غنچے توڑ توڑ کر ڈالتی ——— جب تک گڑھا
پُر نہ ہو جاتا پھر وہ جھک کر ان پھولوں کو سونگھتی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ جاتا
آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگتے۔ وہ گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگتی

وہ شریر نڈر چڑیاں تک بھی وہاں نہ ہوتیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی بند
ہو جاتی۔ سائیں سائیں سی اس کے کانوں میں ہونے لگتی۔ وہ دیوانوں
کی طرح چاروں طرف ڈر ڈر کر دیکھتی خوف سے سہمے سہمے پھر ایک دفعہ
گڈھے میں پڑے ہوئے پھولوں کو اٹھا کر چومتی ٹھنڈی ٹھنڈی ہری
ٹہنیوں کو چومتی گرم چہرے پر آہستہ آہستہ سہلاتی ـــــ جھلملاتے
ہوئے آنسو رخساروں پر بہنے لگتے۔ آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ وہ پھولوں
کا منہ اپنے آنسوؤں سے تر کر دیتی۔ پھر آسمان کی طرف گھورنے لگتی۔
وہاں کچھ بھی تو نہ ہوتا تھا۔ نیلا آسمان جہاں روئی کے گالے جیسے سفید
سفید بادلوں کے ٹکڑے اور کالے کالے دھبوں کے سوا کچھ بھی تو نہ
تھا۔ نہ جانے وہ کیا ڈھونڈھتی تھی۔ اس نیلے پردے کے پیچھے۔ گھنٹوں
اسی طرح گذر جاتے تھے۔ تیز دھوپ میں وہ سرخ ہو جاتی۔ پسینے میں
تر بتر، ہونٹ ہلنے لگتے۔ نہ جانے کیا بڑبڑاتی۔ سینے سے لگائے ہوئے
پھولوں کی ہری ٹہنیوں کو زور سے گڈھے میں پھینک دیتی پھر تیزی
سے اس میں مٹی بھرنے لگتی۔ دبا دبا کر محنت سے گڈھا پر کر دیتی جیسے
بہت ہی ضروری کام کر رہی ہو۔ یہانتک کہ ایک اونچی سی چھوٹی
سی قبر بنا لیتی۔ پھر محبت بھری نگاہوں سے اسے گھنٹوں دیکھتی رہتی
جیسے اسے نیند آ رہی ہو ـــــ سرخ چہرہ سفید پڑ جاتا۔ کیاریوں میں

ٹھہرے ہوئے پانی سے اونچی چھوٹی سی قبر کو لیپنے لگتی۔ مسکرا مسکرا کر اُسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی۔ پھر بھاگتی ہوئی۔ ڈھونڈ ڈھوند کر سوکھی ہوئی ٹہنیاں لاتی۔ خاردار جھاڑیاں توڑ توڑ کر لاتی۔ بھاگتے ہوئے قہقہے لگاتی۔ بدحواسی سی ایسی گھبراہٹ میں جیسے اُسے بہت کام کرنا ہے کیاریوں میں بھاگتی ہوئی۔ نرم کونپلوں کو چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں کو پیروں سے روندتی ہوئی۔ آتی۔ چھوٹی سی اونچی قبر پر خاردار جھاڑیاں لگاتی کبھی کانٹے اس کی لمبی لمبی پیلی انگلیوں میں چبھ جاتے مگر جیسے اسے تکلیف ہی نہیں ہوتی۔ پھیکا پھیکا خون رسنے لگتا۔ لیکن وہ پھر چھوٹی سی قبر سجانے میں منہمک ہوجاتی۔ سوکھی ہوئی پتیوں کا چورا چورا کر کے قبر پہ بکھیر دیتی۔ مسکرا مسکرا کر کتنی تیزی سے وہ یہ سب کرتی ——————

کیاریوں کے پاس کئی چھوٹی بڑی ٹوٹی ہوئی، بے ترتیب سی قبریں بنی ہوئی تھیں۔ جن پر باریک سی لکیریں پڑی ہوئی تھیں جیسے کسی نے باریک سلائیاں گیلی گیلی مٹی پر ہلکے ہلکے پھیری ہوں۔ جس سے گیلی مٹی پر باریک ٹیڑھی ٹیڑھی سی لکیریں پڑ گئی ہوں۔ دوسرے روز آ کر وہ غور سے ان لکیروں کو دیکھتی۔ گھنٹوں سنجیدگی سے جیسے کسی نے جلدی میں کچھ لکھ دیا ہو۔ اور بہت کوشش کرنے کے باوجود نہ پڑھا جاتا ہو۔ وہ غور سے ان لکیروں کی گہرائیوں میں نہ جانے کیا ڈھونڈتی۔ دیکھتے دیکھتے وہ مسکرا دیتی اس کا سفید

چہرہ سرخ پڑ جاتا۔ پیلی پیلی سی ہتھیلی پھیلا کر لمبی لمبی کانپتی ہوئی انگلیوں سے سوکھی ہوئی ننھی ننھی مٹی کی گول گول گولیاں سی آہستہ آہستہ اٹھا کر رکھتی۔ آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتیں۔ وہ بھاگ جاتی۔ قہقہے لگاتی ہوئی پاگلوں کی طرح۔

نرم نرم قالین پر مٹی میں بھرے ہوئے پیروں سمیت، وہ اخبار پر جھکے ہوئے سفید بالوں سے ڈھکے ہوئے سر کو اپنے مٹی میں بھرے ہوئے ہاتھوں سے زور سے اونچا کرتی اور پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتی ...... بابا..... بابا ـــــ آج پھر مجھے سلیم بیٹے کی قبر پر سے اس کے کھیلنے کی گولیاں ملیں ـــــ وہ دیوانہ وار ننھی مٹی کی گولیوں کو چومتی ـــــ میرا لال، میرا سلیم ان گولیوں سے کھیلا کرتا تھا۔ بابا .... دیکھیں گولیاں۔ وہ بری طرح قہقہہ لگاتی ہوئی کمرے سے بھاگ جاتی ـــــ سفید سر دروازے کی طرف مڑ جاتا۔ لرزتی ہوئی آواز کمرے میں گونجنے لگتی ـــــ غریب بٹیا کی ـــــ پاگلوں سے بدتر حالت ہو گئی ـــــ کیچوے کی کھائی ہوئی مٹی جو گھانس میں گولیوں کی صورت میں پڑی رہتی ہیں اٹھا لاتی ـــــ اے خدا رحم کر۔ میری بٹیا پر۔ کس منحوس گھڑی میں میں نے بٹیا کا بیاہ کیا تھا

شادی کے تین مہینے بعد غریب کا سہاگ اجڑ گیا ——— پھر وہ معصوم ننھا سا سلیم ہوا جس سے یہ اپنا غم بھول گئی ——— آہ! اے قدرت تیرے کیا ہاتھ آیا —— تو نے وہ بھی چھین لیا ——— غریب بڈھیا اب مٹی کی گولیوں سے تسلی دیتی ہے اپنے دکھے ہوئے دل کو ——— اور یہ . . . . مٹی کی گولیاں ———

تاروں کی چھیّاں میں ... کیا ہو رہا تھا؟

5/1.00

ہائے رے رخشی یہ ہلکی ہلکی اداس سی چاندنی اور یہ دھندلا سا چاند۔۔
۔۔۔ یہ سرد سرد ہوائیں۔ جیسے سسکیاں بھرتی ہوئی ہمارے قریب سے
بچکر نکل جانا چاہتی ہوں۔ ہائے رخشی میں کیا کروں۔ کیا زندگی ہے۔ یہ
کیسے دن آئے ہیں جو کاٹے نہیں کٹتے ــــ رخشی میری پیاری رخشی
سچ بتاؤ کیا تم بھی ایسی ہی بے چینی محسوس کرتی ہو ــــ نہیں رضی۔ میری
جان سے زیادہ عزیز رضی۔ تم آج اتنی بے چین کیوں ہو۔ بے چین تو میں
بھی نہیں۔ مگر نہ جانے اتنی شدت سے ۔۔۔ میرے جذبات مجھے بھی
کیوں نہیں تڑپا دیتے۔ تمہارا تصور نہیں میری پیاری رضیہ۔ بھولی سی
معصوم رضی۔ یہ صرف تمہارے تصورات نے تمہیں تباہ کر دیا اور کر

رہے ہیں تم خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھالو۔ میری رضی ـــــ تم غلط راستے پر چل نکلی ہو ـــــ یہ مجھے معلوم ہے جب تم کو معلوم ہوگا۔ ـــــ کہ تم اپنی زندگی کی منزل کو اب تک نہ پاسکی ہو ـــــ ابھی تک بھٹک رہی ہو۔ ایسے راستے پر سرگرداں ہو جہاں سے تم نا امید لوٹو گی ـــــ تب، ـــــ آہ میری رضی . . . . خدایا وہ وقت مجھے نہ دکھانا تمہارا نازک سا تڑپتا ہوا بے چین دل۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا اور پھر شاید میری معصوم رضی مجھے ڈر ہے کہ تم اپنا پیمانۂ صبر چھلکا نہ دو۔ ـــــ اور رسوا نہ ہو جاؤ۔ ـ ـ ـ ہائے پروردگار ـ ـ ـ پھر شاید میں ـ ـ ـ میں اپنی حسین تخئیلات کی ملکہ کو دیکھ بھی نہ سکوں ان حسین سیاہ آنکھوں کے چمکیلے پانی میں تڑپتی ہوئی۔ آرزوؤں کو میرے آنسو کبھی بھی ٹھنڈا نہ کرسکیں گے ـــــ خدا کے لئے رضی تم ہوش میں آؤ۔ جانتی ہو تم صرف غلط فہمی میں حسین خواب دیکھ رہی ہو۔ اور جب . . . . . . جب تم پر حقیقت کا انکشاف ہوگا ـــــ تب تمہارا رنگین خواب کب کا تمہارا ساتھ چھوڑ چکا ہوگا ـــــ میری رضی میں تم کو اتنا عزیز سمجھتی ہوں جتنا ایک سچا ہمدرد ایک حقیقی بہن ایک حقیقی بہن سے ـــــ محبت کرے ـ ـــــ راحیل کو تم اب تک غلط سمجھ رہی ہو ـــــ مانا کہ وہ میرا بھائی ہے خوبصورت ہے۔ گریجویٹ ہے۔ ہر طرح سے قابل ہے مگر رضی

جب میں اس کے مقابلہ میں تم کو دیکھتی ہوں تو دل ایک دم سے دھک سے رہ جاتا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا چھا جاتا ہے تم ایک نرم و نازک دل کی مالک پُرکشش چہرہ کی مالکہ۔ تمہارے حصے میں مسکراہٹ نے جنم لیا۔ قہقہوں سے کھیلی ہو۔ آزادی کے جھولے میں جھول رہی ہو۔ اور شعر و ادب کی ہمجولی ——— تم تباہ ہو جاؤ گی۔ اپنی آزادی کا گلا تم خود غلط فہمی میں ایک دن گھونٹ لو گی اور پھر یہ شگفتہ کلی چند دن کی بہار کے بعد کھلنے سے پہلے مرجھا جائے گی ——— اس وقت کی حالت مجھ سے نہیں دیکھی جائے گی۔ راحیل کو تم سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ——— رضی میں تمہاری بھلائی کے لئے کہہ رہی ہوں۔ میں انہیں اور اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی جب تم میری بھابی بنتیں مگر رضی میں تم کو قربانی کا بکرا نہیں بنا سکتی مجھے تم سے ہمدردی ہے اور افسوس ہے اپنے خوبصورت بھائی پر۔ کاش وہ اپنے خیالات تبدیل کر سکتا ——— ایم' اے کرنے پر بھی وہی ایک زمینداروں جیسے دماغ کا مالک پرانی لکیر کا فقیر ——— کتنا مغرور قسم کا انسان ——— اس کے مقابلے میں تم جیسی ہنس مکھ آزاد خیال معصوم رضیہ ہائے راحیل میرا حقیقی بھائی ہے۔ میرا خون ہے ——— مگر جانتی ہو رضی بس ——— اس کو تم پر سے قربان کر دوں ——— ہائے رخشی ایسا نہ کہو ——— خدا کے لئے میرا دل آج نہ جانے کیوں بے چین ہے ———

چلو اندر چلیں تم جانتی ہو چاندنی رات میں پاگل ہو جاتی ہوں۔ نہ جانے کیوں جی چاہتا ہے کہ روتی ہی جاؤں۔ خوب جی بھر کے روؤں ـــــ

رخشندہ اور رضیہ کی آواز اب اور بھی دھیمی ہوتی گئی ـــــ راحیل نے کرسی پر سے اُٹھ کر تاروں پر چڑھی ہوئی عشق پیچاں کی بیلوں میں سے ـــــ دھڑکتے ہوئے دل سے پتوں کو آہستہ آہستہ ہٹا کر دیکھنا شروع کیا ـــــ

اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ ٹانگیں بھی لرز کر رہ گئیں ـــــ ماتھے پر پسینہ کے قطرے بہہ رہے تھے ـــــ اس نے دیکھا' ہلکی ہلکی زردسی اُداس چاندنی میں رضیہ کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا ـــــ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ پریشان سنہری بال سیاہ باریک دوپٹہ میں سے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے ـــــ اُسے آج اپنی عمر میں پہلی بار عورت اتنی خوبصورت نظر آئی۔ رضیہ کا اداس سا چہرہ سیاہ شریری سی آنکھیں آج نہ جانے اتنی غمگین کیوں تھی۔ وہ رخشندہ کی باہوں میں باہیں ڈالے ٹہل رہی تھی۔ ہری ہری نرم گھانس پر اس کے گورے گورے نازک سے پیر جو چپلوں میں سے صاف نظر آ رہے تھے۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس کے دھڑکتے ہوئے دل کو کچل رہے ہوں ـــــ اتنی باتیں نہ جانے وہ کیوں حبب سے سن رہا تھا ـــــ

اس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ رخشندہ کی ہزاروں سہیلیاں آتی تھیں۔ مگر اس نے کبھی بھی کسی سے دلچسپی نہیں لی مگر ——— رضیہ ——— رضیہ ——— رضیہ اب رخشندہ کے شانے پر سر رکھے ہوئے اداس اداس نظروں سے پھیکے پھیکے سے دھندلے چاند کو دیکھ رہی تھی ——— دھیمی سی آواز پھر بلند ہونی شروع ہو گئی ——— رضیہ آہستہ درد بھری آواز میں گنگنا رہی تھی ؎

اے دل تری دنیا کو ہم آپ لٹا بیٹھے ارمانوں کی بستی کو ہم آگ لگا بیٹھے
ہم آنکھوں کے پردوں میں ساون کو چھپا بیٹھے پانی میں بہا دیں گے گھڑیاں تری فرقت کی

سیاہ چمکیلی سی بے چین آنکھوں میں رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے ——— اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بندھ گئیں۔ گلابی گلابی ہونٹ کانپنے لگے وہ ایک دم سیدھا کھڑا ہو گیا۔ جھکے جھکے اس کی کمر دکھنے لگی تھی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا سہمی سہمی نظروں سے ———

مگر ——— کوٹھی میں کوئی بھی نہ تھا۔ سب بچے اور گھر کے سب بڑے پاس ہی کوٹھی میں دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ آج اس کا کلب میں بھی دل نہیں لگا تھا۔ اس لئے وہ جلدی ہی واپس آ گیا تھا مگر کوٹھی میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ ٹہلتا ٹہلتا کوٹھی کے پچھلے کمپاؤنڈ کی طرف نکل گیا ——— جہاں سے کچھ باتوں کی آوازیں جیسے اسے کھینچ رہی تھیں۔ وہ

جھاڑیوں میں تاروں پر چڑھی ہوئی بیلوں کو آہستہ آہستہ ہٹا کر دیکھ رہا تھا ——
وہ کانپ رہا تھا —— جیسے پہلی دفعہ چوری کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور
قدم نہ اٹھ رہے ہوں۔ اس کو اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز بھی آج بہت
زور سے معلوم ہو رہی تھی۔ اُسے ڈر تھا کوئی سن نہ لے تھوڑی سی جھاڑیاں
ہلیں وہ خوف سے کانپنے لگا —— مگر نہ جانے کیا چیز تھی۔ کوٹھی میں
آدمی کوئی بھی نہ تھا۔ اس کی انگلیاں خود بخود عشق پیچاں کی بیل کے پتوں
سے کھیلنے لگیں۔ رضیہ اور رخشندہ اب ایک دم اس کے سامنے بینچ پر بیٹھی
تھیں۔ کالے باریک ریشم کے دوپٹے میں لپٹا ہوا اس کا مرجھایا ہوا خوبصورت
معصوم سا چہرہ بھیگی ہوئی چمکیلی پلکوں میں آنسو چمک رہے تھے ——
اس کے پتلے پتلے ہونٹ کپکپاتے۔ اور اس نے اپنے گدرے گورے
ہاتھوں میں رخشندہ کے گول گول ہاتھ زور سے دبائے ہوئے نیچی نظریں
کئے ہوئے کہنا شروع کیا۔ رخشی پیاری تم کتنی بھولی ہو۔ بالکل اپنے راحیل
کی طرح۔ وہ بھی سب کچھ جانتے ہوئے بنتے ہیں۔ دوسروں کو تڑپانا ان کا
شیوہ ہے آخر اگر وہ —— انہیں اگر کچھ بھی خیال نہیں تو رخشی تم
بتاؤ ایک ایسا شخص بقول تمہارے مغرور قسم کا لڑکا جو کبھی کسی سے زیادہ
بات نہ کرتا ہو اور ...... وہ پھر اس روز رات کو جب فرزانہ آپا کی سہیلی
آئی تھی ڈنر پر تم نے پھر بھی اندازہ کیا تھا۔ اس روز رات کو ——

یاد ہے میں کبھی نہیں بھولوں گی رخشی جب سب لڑکیاں کاریں بھر گئی تھیں پچھلی طرف اور ایک میں رہ گئی تھی۔ اس روز ڈرائیور کو بخار ہو گیا تھا۔ تب فرزانہ آپا خوشامد کرتی رہیں راحیل بھیا کی کہ میری سہیلی کو چھوڑ آؤ تو وہ ——— جانتی ہو انہوں نے کس نفرت سے تیوری پر بل ڈال کر کہا تھا۔ جی نہیں مجھے معاف رکھیں اپنی سہیلیوں سے آپا جان۔ پاپا جان چھوڑ آئیں گے۔ مگر جب تم نے کہا کہ رضیہ کو جلدی جانا ہے تو وہ ——— کیسے سٹ پٹائے تھے اور ان کے سفید سفید چہرے کا رنگ کتنا سرخ ہو گیا تھا۔ اس وقت میری جان نکل گئی تھی۔ کیونکہ فرزانہ آپا مسکرا کر کبھی راحیل بھیا کی طرف دیکھ رہی تھیں اور کبھی میری طرف۔ انہوں نے کس بیوقوفی سے کہا تھا اچھا لاؤ موٹر کی چابی۔ مجھے اس وقت ایسا محسوس ہوا تھا رخشی جیسے مجھے کسی نے ایک ہاتھ میں اٹھا کر آسمانی فضاؤں میں چھوڑ دیا ہو۔ جہاں میں اُڑتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اور ٹھنڈی ہوا کے جھوکوں میں جیسے بہی جا رہی تھی۔ اور پھر شرمندگی مٹانے کو فرزانہ آپا کو منہ چڑا کر کہا تھا۔ آپا سچ کہہ رہا ہوں تمہاری آنسوؤں سے لبریز آنکھوں نے مجبور کیا ہے۔ ورنہ کبھی نہ جاتا۔ جہاں کار کھڑی تھی۔ اس روز بہت اندھیرا تھا نہ جانے انہیں نے میری کالی ساڑھی کیسے پہچان لی تھی جب ساری لڑکیاں بیٹھ گئیں تو میں اور جولی رہ گئے۔ جولی کو میں نے آگے ان کے

پاس بیٹھنے کا چپکے سے اشارہ کیا اور میں روحہ کی گود میں پچھلی طرف بیٹھنے والی تھی جو انہوں نے مجھے پکارا۔ آہ رخشی اپنی اتنی ملاقاتوں میں، میں نے پہلی بار ان کے منہ سے اپنا نام سنا۔ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میری کیا حالت ہوئی۔ اس اندھیرے میں بھی ان کا چہرہ چمک رہا تھا۔ اور وہ سیاہ چمکیلی آنکھیں شاید میری پریشانی کا اندازہ کر رہی تھیں آخر انہوں نے تیوری پر بل ڈال کر دوبارہ آواز دی۔ مگر آہستہ سے۔ تم اس طرف آجاؤ اور یہ صاحبہ بھی کیونکہ پیچھے جگہ نہیں تھی ——— میں اپنے بوجھل جسم کو بمشکل اٹھاتی ہوئی باہر تو آئی۔ نہ جانے اتنا بوجھ کیوں ہو گیا تھا۔ اور کار کے دروازے کے پاس آکر رک گئی جو کی، کو میں نے آہستہ سے کہا کہ وہ ان کی طرف بیٹھ جائے حالانکہ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر انہوں نے نہایت ہی غصہ سے حکم دیتے ہوئے کہا۔ دیر ہو رہی ہے کس قدر سست ہو جلدی اندر بیٹھو میں کچھ سہم سی گئی اور ان کے قریب بیٹھ گئی۔ کئی دفعہ آپ کا ہاتھ میرے جسم سے ٹکرایا۔ بریک لگاتے وقت سیدھی سڑک تھی نہ جانے کیوں۔ اور بھولی رضی یہ سب غلط فہمی ہے۔ یہ سب قصور تمہارے اس دماغ کا جو تم ایک معمولی سی بات کا سوچتے سوچتے ایک رومانی پہلو نکال لیتی ہو۔ وہ تو بے حس سا لڑکا ہے مغرور۔ اس میں مجھے کوئی لگاوٹ نظر نہیں آئی، اور نہیں رخشی مجھے محسوس ہوا۔ پاگل رضی یہ صرف تمہارے دماغ کا خلل ہے

ورنہ اس شخص سے اور کسی کو ہمدردی کی اُمید ——— جانتی ہو گھر بھر
میں کوئی چھوٹا بچہ نہیں فرزانہ آپا کی بچی صبیحہ کتنی پیاری ہے ———
سارا گھر بھر اسے کتنا پیار کرتا ہے۔ مگر چار مہینے اسے آئی کو ہوئے۔
مجال ہے جو کبھی اس سے بات تک کی ہو یا کوئی چیز اسے بازار سے
لا کر دی ہو۔ گھر کی کسی بات میں کوئی انٹرسٹ نہیں! ہاں جب کبھی میں
اور فرخندہ کہیں کسی سہیلی سے ملنے جاتیں تو چپکے سے پاپا جان کو کہہ دیتا ہے
آپ نے لڑکیوں کو بڑی آزادی دے رکھی ہے۔ حالانکہ خود کالج میں
لڑکیوں کے ساتھ پڑھتا ہے۔ مگر رخشی ——— وہ اتنے strict ہیں تو
مجھ سے کیوں کبھی کبھار بات کر لیتے ہیں۔ مگر جب کوئی نہیں ہوتا یہ عجیب
عادت ہے ان کی' یا خود شرماتے ہیں۔ یا پھر تم سے ڈرتے ہیں' کیوں
ٹھیک ہے نا۔ جب ان کو لڑکیوں سے نفرت ہے تو وہ نا ——— رخشی
پھر مجھ سے کیوں بولتے ہیں انہیں معلوم ہے میں نے ڈانس کالج جوئن
کر رکھا ہے اس میں لڑکے لڑکیاں اکٹھے سیکھتے ہیں۔ ان کے نقطہ نظر
سے میں پھر بہت ہی بُرے کیریکٹر کی لڑکی ہوں گی مگر پھر بھی وہ مجھ سے
بولتے ہیں۔ یاد ہے جب ان کے سر میں اس روز کتنا درد تھا۔ صبح سے شام
تک وہ اپنے کمرے میں پڑے رہے کھانا بھی نہیں کھایا تھا ——— رخشی
پیاری تم نے اس روز کچھ اندازہ نہیں لگایا ——— جب میں تم کو لے کر

ان کے کمرے میں گئی تھی۔ بہانے سے اور تم نے ان کی میز پر سے فلم انڈیا
اور ایسٹرن ویکلی اُٹھاتے ہوئے کہا تھا۔ لو رضی یہ تو بل گئے کاروان نہ
جانے کہاں ہے اور تم میز پہ اور کمرے میں یونہی ڈھونڈ رہی تھیں حالانکہ
ہم خود ڈرائنگ روم میں صوفے پر رکھ کر آئے تھے پڑھتے پڑھتے اور
میں نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا تھا وہ سر سے رومال باندھے
سرہانے کی کھڑکی میں سے دور آسمانی فضاؤں میں کیا ڈھونڈ رہے
تھے۔ ان کا رنگ کس قدر سرخ ہو گیا تھا۔ اور میں نے پھر ڈرتے
ڈرتے مری ہوئی آواز میں پوچھا تھا اب آپ کے سر میں درد کم ہوا کہ
ویسا ہی ہے۔ اور انہوں نے گھبرا کر اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ نہیں تو ——
اور جیسے ان کی سیاہ سی اُداس سی آنکھیں کچھ ایسے انداز سے کہہ رہی تھیں
—— تمہیں کیا، اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا بیچین دل تڑپتا ہوا
باہر کھنچا چلا آ رہا ہو اور سیاہ نگاہوں کے چمکیلے پن میں مجھ کو چھپا لے گا
پھر انہوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے گھبراتے ہوئے پوچھا تھا کیوں
آپ بمبئی نہیں جا رہی ہیں۔ سنا تھا، میں حیران رہ گئی تھی۔ اور جھجکتے ہوئے
میں نے پوچھا تھا۔ آپ کو کیسے معلوم کہ میں بمبئی جا رہی ہوں۔ وہ مسکرا رہے
تھے۔ ہمیں بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ آخر پھر بمبئی میں نے بھی مسکراہٹ سے
جواب دیا۔ وہ کتنے بے تکلف ہو گئے تھے —— اور میں بھی . . .

لیکن ساتھ کے کمرے میں پاپا جان کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ کتنے گھبرا گئے تھے اور اس وقت تو سچ مچ ہمارے بھی ہاتھ پیر پھول گئے تھے، اور انہوں نے گھبراہٹ میں اٹھتے ہوئے باغیچے کی طرف کا دروازہ کھولدیا تھا —— اور تم مجھے گھسیٹتی ہوئی ایک ایک سیڑھی کے بجائے دو دو سیڑھیاں طے کر رہی تھیں —— ہم بھاگتے ہوئے اسی چھوٹے انار کے پیڑ کے نیچے پہنچ گئے تھے اور میں نہ جانے کون کونسے جذبے سے مغلوب ہو کر تم سے کس زور سے لپٹ گئی تھی —— اور تم بری طرح ہنس رہی تھیں —— یاد ہے، رخشی' —— وہ مسکرا رہی تھی، ایسی مسکراہٹ جس میں ہزاروں یادیں دبی ہوئی تھیں —— وہ پھیکے پھیکے داغدار سے چاند کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی —— وہ پھیکی پھیکی اداس سی چاندنی میں کھو گئی تھی —— گذشتہ یادوں میں اس کے لطیف تصورات سے اس کے سفید چہرہ پر تھوڑی تھوڑی سرخی دوڑ گئی تھی۔ وہ نڈھال سی زینج کے شانے پر اپنی نرم نرم سفید باہیں پھیلائے ہوئے لیٹ سی گئی تھی —— سیاہ سیمیں دوپٹہ اب سینے پر مچل رہا تھا۔ کھلے ہوئے پریشان بال ہوا میں لہرا رہے تھے —— عورت کتنی حسین ہوتی ہے وہ آج متحیر سا ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے ہری گھانس پر جہاں چاروں طرف سیاہی ہی ہی

درخت ہی درخت تھے۔ جن کے پتوں میں سے اداس پھیکی پھیکی چاندنی
چھن چھن کر رضیہ کے اوپر پڑ رہی تھی ——— ستاروں کی چھیا میں ایک
سنسان سے ہرے بھرے پر سکون سے کنج میں بینچ پر رضیہ ایسی بیٹھی
تھی جیسے آسمانی فضاؤں سے کوئی حور۔ معصوم سی گھبرائی ہوئی بھوسے
سے اس پھیکی پھیکی روشنی میں۔ اس پر سکون کنج میں ذرا یونہی سی اترتی
چلی آئی ہو ——— اس کی چمکتی ہوئی سفید سیاہ چمکتے بالوں میں گھری
ہوئی پیشانی پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے ——— جھاڑیاں سہم کر
ایک دوسرے سے لپٹ گئیں ——— سر سے کوئی کالی سی چمکیلی
چیز نہ جانے جھاڑیوں میں ہوتی ہوئی بینچ کے پیچھے رات کی رانی کی پودوں
میں غائب ہوگئی ——— وہ نجانے کیوں کانپ گیا۔ اُسے یاد آیا۔
کل ٹھیک اسی وقت شیر سنگھ مالی نے جب وہ گشت کرتا ہوا گذرا
تھا تو رات کی رانی کی جھاڑیوں کے پاس پھولوں کے گچھے میں لپٹا ہوا
سیاہ سانپ دیکھا تھا جسے اس نے لٹھ سے کس ہوشیاری سے
مارا تھا۔ آج پھر اس طرف سیاہ سی کوئی چیز گئی ہے۔ اور یہ بیوقوف
سی لڑکیاں ساری کوٹھی چھوڑ کر اس وقت یہاں آکر بیٹھی ہیں۔ وہ
بڑبڑایا وہ بھی تو خود بیوقوف ہے اتنی دیر سے Hedge کے پیچھے
کھڑا جھانک رہا تھا۔ وہ گھبرایا جلدی کچھ انتظام کرنا چاہئے۔ اور

بھاگتا ہوا شیر سنگھ کو لٹھ سمیت لے آیا۔ ابھی وہ گیٹ تک پہنچا بھی نہ تھا جو دو چیخوں کی آواز نے اسے اور بھی تیز کر دیا —— گھستے ہی جیسے اس کے سارے جسم کی جان ہی تو نکل گئی۔ رخشندہ بدحواس بینچ سے کچھ دور پر کھڑی ہوئی تھی۔ خوف سے رنگ زرد پڑ گیا تھا اوہ راحیل بھیا —— خدا کے لئے رضیہ کی جان بچائیے۔ اور شیر سنگھ کچھ کر گردن میں میں بُری طرح سے لپٹ گیا ہے —— ہائے میری رضی —— شیر سنگھ لٹھ پھینک کر ایک دم بھاگ گیا۔ راحیل بھیا کچھ کرئیے —— میں اور رضی اس بینچ پر بیٹھے تھے کئی دفعہ رات کی رانی کے پودوں میں کوئی چیز سرسرانی رہی۔ ہمیں خیال بھی نہ تھا۔ رضی کے بال کھلے ہوئے بینچ کے پیچھے لٹک رہے تھے۔ ایک دفعہ ہی اس کے شانے پر کوئی چیز سرسرائی اس نے جو مڑ کر دیکھا تو سانپ تھا۔ اور اب تو گلے میں اچھی طرح سے لپٹ چکا ہے۔ راحیل بھائی خدا کے لئے کچھ کیجئے ہائے لنا یہ سنگدلی اچھی نہیں۔ میری معصوم رضی —— رضی کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا سیاہ بالوں میں گھری ہوئی سفید چمکیلی . . . . پیشانی کو سیاہ مست چمکیلا سانپ چومنے کی کوشش کر رہا تھا ——

چاندنی رات میں تاروں کی چھیاں میں زندگی اور موت آنکھ مچولی کھیں رہے تھیں۔ ایک دفعہ ہی سنسان فضا میں دور کوئی بین بجاتا ہوا آ رہا تھا۔ بین کی

آواز قریب ہوتی جارہی تھی رخشندہ کی آنکھیں چمکنے لگی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا دھڑکتا ہوا دل تھامنے کی کوشش کی اور چمکیلا کالا پھن کالے بالوں میں لپٹ کر اور بھی جھومنے لگا —— وہ ایک دم سرد پڑ گیا تھا' آج وہ سچے دل سے گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگ رہا تھا آج پہلی دفعہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ وہ تڑپ رہا تھا اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی زندگی کے لمحے کچھ دیر میں ختم ہونے والے ہیں۔ اس کا گلا گھٹتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دعا مانگ رہا تھا اے زہریلے سانپ تو اپنی ہی ہم جنس کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اس نازک گردن کو چھوڑ دے جس کے اندر محبت کا رس ہی رس ہے۔ جس میں سریلے نغمے پنہاں ہیں۔ چھوڑ دے میری زندگی ختم ہو جائے گی۔ آ اور مجھے سزا دے کہ میں نے ایک معصوم دل کو پہچانا نہیں اب ظلم نکر وہ آنکھیں بند کئے کھڑا تھا —— کئی دفعہ اس نے سانپ کو پکڑنا چاہا تھا۔ مگر پھر رک گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ڈرا نہیں سانپ کو پکڑنے سے اُسے ڈر تھا کہ جس چمکتی ہوئی پیشانی کو وہ چومنا چاہتا ہے۔ کہیں مجھے بڑھتے ہوئے حسد سے وہ چوم نہ لے۔ اور سیاہ چمکیلی نوکدار پلکیں سیاہ آنکھوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہ ڈھک لیں آہ۔ وہ اس خیال سے بے چین ہو جاتا مگر وہ ہوش میں آگیا۔ جب اس نے دیکھا کہ شیر سنگھ بین بجاتے ہوئے رضیہ

کے سامنے بیٹھ گیا وہ ایسے دردناک نغمے تھے کہ رضیہ کے گلے کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی اور اس کے شلنے پر سے ہوتا ہوا وہ سانپ تیزی سے شیر سنگھ کی طرف لپکا ـــــــ اور اس کے بالکل قریب مست ہو کر جھومنے لگا۔ راحیل میں اب جان آ گئی تھی اور اس نے چپکے سے شیر سنگھ کے ڈنڈے کو اٹھا کر مست جھومتے ہوئے سانپ پر مارا۔ ڈنڈا کمر پہ لگا تھا انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی تھی مگر کمر کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی وہ تڑپ کر شیر سنگھ کی طرف لپکا مگر شیر سنگھ اچھل کر اب اس کا سر پتھر سے کچل رہا تھا ـــــــ اس نے مردہ زخمی سانپ کو اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھا سرکار یہ ساپن تھی جس کا سانپ کل میں نے مارا تھا۔ اور بڑی خیر ہو گئی اس نے شرمندہ نظروں سے رخشی کی طرف دیکھا اور نہ جانے کتنی مدت بعد اس کے منہ سے لفظ نکلے۔ رخشی بہن پانی جلدی سے لاؤ رضی ابھی تک بے ہوش ہے۔ جلدی کرو۔ اور شیر سنگھ کو کچھ دوا لانے کو کہا جب رخشی پانی کا جگ لئے بھاگتی ہوئی آئی تو اس نے دیکھا وہ ایک دم ٹھٹک گئی۔ اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی ـــــــ پھیکی پھیکی چاندنی میں تاروں کی چھیا میں۔

راحیل کی رانوں پر رضیہ کا سر رکھا ہوا تھا۔ اور وہ رومال سے اس کے چہرے کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ اس کے سیاہ بکھرے

ہوئے بالوں میں اس کی انگلیاں تیر رہی تھیں ـــــ . . .

رضیہ کے مرجھائے ہوئے چہرے پر ایک طنز یہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ سنسان فضا میں ایک لرزتی ہوئی آواز گونجی۔ میری رضی آنکھیں کھولو، رضی، اور وہ اس کے چہرہ پر جھک گیا ـــــ وہ اس وقت کتنی معصوم نظر آرہی تھی۔ نرم نرم گھاس پر پھیکی پھیکی روشنی میں تاروں کی چھیّا میں دو سائے تھرتھرا رہے تھے۔

زندگی کی پہلی بھول

...... میں کیا کر بیٹھیں آپ؟

اگر اس حالت میں یہ کتاب کو مس صاحبہ کے منہ پر مار دیں تو شاید وہ پھر آئندہ سے لکھنا ہی چھوڑ دیں۔ ذرا سوچنا۔ سچ مچ۔

آج ـــ آخر ـــ میں مدّت کے بعد حالات کے تحت اپنے پرانے مکان میں واپس آیا ـــ تو مجھے علم ہوا میری بصارت مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی تھی ـــ شاید ـــ کیا واقعی ـــ تم میرے کوئی نہیں ـــ آہ ـــ میں نے دھوکا کھایا ـــ آج جمعرات تھی ـــ میں بےچین تھا ـــ مدتیں گذریں ـــ تم کو دیکھا نہیں تھا تم بھول گئے ـــ شاید تم بیمار تھے ـــ میری روح بے قرار ہو گئی ـــ مدتیں ہوئیں مجھے تم سے بچھڑے ہوئے ـــ میرے لال ـــ کیا تمہاری محبت کی آخرت ـــ مٹی میں ملا دینے تک تھی ـــ مگر ـــ میں بے چین ہوں، میری روح کو ابتک

سکون نہیں ——— ہاں ——— تمہارے کراہنے کی آواز مجھے
یہاں سنائی دی ——— جہاں تمہاری جیسی ہستی کا گذر تک نہیں
——— جہاں میں اور فطرت کی صنعت کاری ——— وہ حسین
و معصوم نورانی چہرے ——— اکثر میری دل جوئی میں مصروف رہتے
ہیں ——— آج میرا دل بے چین تھا ——— میرے خطا وار کانوں
نے تمہاری حسرت میں ڈوبی ہوئی آواز اس مقدس دنیا میں بھی سن لی ——
میری روح بے چین ہو گئی ——— وہ نغمے جب مجھے ابھی مدہوش بنا رہے
تھے ——— تمہاری درد سے کراہتی ہوئی آواز نے مجھے بیدار کر دیا ———
میں تڑپ اٹھا ——— آہ ——— میرے دکھوں کا سکھ ———
میرا لال ——— میری روح تجھ میں سما جانا چاہتی تھی ——— تیری تکلیف
مجھے محسوس ہو رہی تھی ——— تری آواز نے مجھے بیقرار کر دیا ——
ابا! میرے پیارے باپ ——— تو کہاں ہے ——— آہ ———
اے میرے معبود ——— تجھے کیا ملا ——— میرے ہاتھ بے اختیار رب
عالی کے حضور میں اٹھے ——— میرے لال کو ——— ربی ———
اب زیادہ تکلیف نہ دے ——— شاید قدرت مجھے تیری محبت
دکھانا چاہتی تھی ——— تجھ کو قدرے سکون تھا ——— رات
بہت گذر چکی تھی ——— تو آرام کی نیند سو رہا تھا سارے گھر میں خاموشی

تھی ——— سب میٹھی نیند میں مدہوش تھے ——— ترے پلنگ کے نیچے میری دنیا کی رفیق ——— حقیقی لفظوں میں تری ماں ——— سو رہی تھی ——— مجھے یاد آیا ——— میں بھی کبھی ایسی ہی محبت سے مغلوب ہو کر تری بیماری میں اکثر راتیں کاٹا کرتا تھا ——— تم اب ——— اپنی تصویر میں نئے نئے رنگ بھرنے میں مشغول تھے۔

سچ بتا ——— کیا تو بھی مجھے یاد کرتا ہے ——— ہاں ——— آج مقدس دن تھا ——— میں اپنے گھر میں آیا ——— جہاں آخری دفعہ تم نے میرا منہ دیکھا تھا ——— اور پھر کبھی خبر نہ لی ——— میں چیخا ہزاروں واسطے دیئے ——— مگر تم ——— تم کو کیا ہو گیا تھا تم میری ذرا سی تکلیف سے بے چین ہو جاتے تھے ——— کیا وہ سب مصنوعی اداکاری تھی ——— نہیں ——— نہیں یہ میری بھول تھی ——— یہ تو دنیا کا پہلا سبق تھا ——— جو شاید میں نے بھی سیکھنے کی کوشش کی تھی ———

ہاں ——— قدرت نے مجھے تمہاری محبت کی سچی تصویر دکھا دی میرے ٹوٹے ہوئے مکان کے آس پاس والے مکان جن کے مالک تم جیسے دکھاوٹ کے مالک نہ تھے ——— میں نے دیکھا ——— کچھ لوگ آئے ——— شام کا دھندلکا چھا چکا تھا ——— نصیب والوں

کے نشان سحد کو چھکتے ہوئے گلاب کے پھولوں نے کھلتی ہوئی چنبیلی کی کلیوں نے چھپانے کی کوشش کی تھی ——— ہوا تیزی سے چل رہی تھی ——— جلتی ہوئی شمع نہ جانے کتنے ارمانوں سے کسی یتیم نے ——— کسی بچھڑے ہوئے بھائی ——— بہن نے ——— کسی لاوارث بیوی نے دھڑکتے ہوئے دل سے جلائی ہوگی ——— مگر ——— آہ ظالم ہوا کے جھونکوں نے ——— چند منٹ بھی تو مزار پر روشنی نہ ہونے دی ۔۔

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اُسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا

اور ایک طویل آہ کے ساتھ ——— شمع نے بھی سیاہ چادر اوڑھ لی ——— اور ——— اپنے پرستاروں کو لے لی۔ دبے کفن پروانوں کو ——— جنہوں نے ——— محبت کی مثال قائم کر دی تھی ———

خیر ——— ۔۔

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

مگر ——— میں اس سے بھی محروم تھا ——— میری سنسان قبر کو دو پھول بھی نصیب نہ تھے ——— کجا شمع و پروانہ کی آخری ملاقات میں اب بھی بے چین تھا ——— میری روح بے قرار تھی ———

مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی ——— کیا تم نے مجھے دھوکا تو نہیں دیا —
میرے کان ——— یہ کیا سن رہے تھے ———

کمرے سے قہقہوں کی پیہم آوازیں آ رہی تھیں ——— میری رفیق
دنیا ——— میرے دکھوں کا سکھ ——— میری جان سے زیادہ
عزیز بیٹی ——— سب مجھے فراموش کر چکے تھے ——— میری روح
کانپ گئی ——— کیا دستورِ دنیا یہی ہے ——— میرا کوئی نہیں...
ہم اعمال کے کردار ———

قدرت میری بے بسی پر مسکرا رہی تھی ——— مجھے تم سب
سے نفرت ہے ——— ہر انسان اپنی اپنی عاقبت کا آپ
ذمہ دار ہے ——— میں بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا تھا ———

جب بیتے دن یاد آتے ہیں

90/100

نگری میری کب تک یونہی برباد رہے گی ــــــ دنیا ــــــ
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی ــــ نگری میری کب تک یونہی برباد رہے گی
ــــــ تالیوں کی آواز سے کلاس روم گونج اٹھا ــــ واہ ــــ
خدایا تم کتنا اچھا گاتی ہو ــــ روحی ــــ ہائے اللہ کاش کہ ہم بھی
ایسا گا سکتے ــــ نجمہ ۔ اقبال ۔ عقیلہ ۔ رفعت وغیرہ نے اپنے اپنے ـــ
دوپٹوں کو ٹھیک کرتے ہوئے ۔ اور ڈیسکوں پر اچھی طرح سے بیٹھتے ہوئے بوچھاڑ
شروع کر دی ہائے روحی خدا کی قسم جب تم گاتی ہو تو یہی جی چاہتا ہے کہ ٹھنڈی ٹھنڈی
ہوا کے جھونکے کہیں اور لے جائیں اور دور تمہاری یہ درد بھری آواز سنائی دیتی
رہے ۔ رفعت اپنی بڑی بڑی پرنم آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے شاعری فرما رہی

تھیں۔ مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ اُف رفعت کس قدر زور شور سے آپ شاعری فرمانے لگی ہیں خیر تو ہے۔ جانتی ہو شاعری جب دنیا کی ہر چیز میں نظر آتی ہے وہ کونسی اسٹیج ہوتی ہے۔ جانتی ہو رفعت' قدسیہ نے اپنی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے سوال کیا اور رفعت کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ہائے میرے اللہ تو نے ابھی سے ہماری معصوم رفعت کو یہ روگ لگا دیا۔ فہیمرو نرہ اپنے گورے گورے

ہاتھ جوڑ کر مسکراتے ہوئے رفعت کے سامنے جھک گئی۔ اور قہقہوں سے ایک بار پھر ہماری کلاس گونج اٹھی شائد آپ سمجھ رہے ہوں کہ عجیب پڑھائی ہوتی تھی کہ گپ شپ ہی نظر آتی ہے۔ نہیں جناب خیر سے ہماری کلاس ٹیچر آج غائب تھی یعنی میرے خیال میں موسم اچھا تھا اور محترمہ کو شاید کسی نے مجبور کیا ہو کہ چلیئے ذرا پکنک ہی پر آج چلیں کیوں۔ کتنا اچھا موسم ہے۔ اور پھر خیر سے وہ ہیں بھی من موہنی ہائے اللہ نیلی جارجٹ کی ساڑھی ہیں مسز شاغل کتنی خوبصورت لگتی ہیں گورا سرخ و سفید سا کتابی چہرہ گلابی گلابی پتلے پتلے ہونٹ سیاہ کرل بال اور چھوٹی چھوٹی لمبی پلکوں والی آنکھیں جو بے حد چمکیلی تھیں۔ لانبی سی ڈبلی پتلی اور ہائے رے جب وہ عنابی رنگ کا جارجٹ کا رومال سر پر باندھ کر موٹر ڈرائیو کرتی ہیں تو سچ کہتی ہوں کہ۔ ۔ ۔ ہم کو اتنی اچھی لگتی ہیں کہ ہم بہانے بہانے یہی منظر دیکھنے کے لئے ان کی کار تک رجسٹر اور کتابیں اٹھا کر لے جاتے تھے کہ کتنی دفعہ ان کی آنکھیں ہائے

اللہ غضب کی خوبصورت لگتی تھیں تو پھر مسٹر شاغل اور ان کے بہت ہی گہرے دوستوں کا کیا حال ہوتا ہوگا ــــــ ہاں تو وہ آج تو بہت ہی خوبصورت ساڑی پہن کر پکنک پر گئی ہوں گی۔ اور اپلیکیشن میں لکھ دیا کہ طبیعت خراب ہے میرا بے اختیار جی چاہا کہ گھر جا کر دیکھ کر آؤں اور جب وہ خوبصورت سی ساڑھی پہنے ہوئے مسٹر شاغل سمیت اور ان کے گہرے دوستوں کے ساتھ اٹھلاتی ہوئی گیٹ سے نکلیں تو میں بے اختیار ناچتے ہوئے ان کے آگے سے نکل جاؤں منہ چڑاتی ہوئی اور جب وہ حیرت سے مجھے دیکھیں تو میں انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے انہیں جتا دوں کہ عادت ہے نمری کھراب۔ بُرا نہ مانو اور تیزی سے بھاگتی ہوئی اپنی منتظر سا تھیوں سے لپٹ جاؤں اور پھر وہ سب گھبراہٹ میں پوچھیں روحہ مسز شاغل گھر ہی نہیں گیا واقعی ان کی طبیعت خراب ہے۔ ہائے اللہ آج وہ کیوں نہیں آئیں۔ اور اسی قسم کے سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو جائے۔ میں سب کو جلانے کے لئے چیخ چیخ کر گانے لگوں' باتیں نہ بناؤ جاؤ جی ــــــ اور وہ سب جل کر گھورنے لگیں۔ ہائے اللہ کتنا مزا آتا مجھے اس وقت۔ اور خاص کر حمیدہ کو دیکھ کر تو ہنسی کے مارے دم نکل جاتا ہے جب وہ گول گول منہ اور بھی غصے میں پھلا لیتی ہے اور دانت پیس پیس کر اپنے سوالات کا جواب نہ سننے پائے اور سنجیدگی سے جواب کے بدلے جلا دینے والے گانے گائے جائیں جو بالکل ایسی لگتی ہے جیسے کھسیانی بلی کھمبا نوچنے پر آمادہ ہو اور کھمبا نہ پا کر میرے نرم نرم

بازوؤں کو بے اختیار نوچنے لگے ــــــ ہائے رے کتنے اچھے دن تھے
جب ہم بچپنے سے خفا ہو کر لڑکپن کو منا رہے تھے۔ ٹن ٹن ٹن ٹن ــــ گھنٹی
کی آواز تھی گویا مضطرب دلوں کی ایک جا آواز تو بہ ہے خدا خدا کر کے ریسس ٹائم
ہوا کمبخت وقت ہی نہ کٹتا تھا۔ کونسی فلم چھوڑی ہوگی جس کے گانے نہ گائے
گئے ہوں کون سی ایکٹریس اور ایکٹر رہ گئے ہوں گے جن پر رائے زنی نہ ہو چکی ہو
کون سے رائٹر چھوڑے ہوں گے جن کے افسانے اور مضامین پر تبادلہ خیالات
نہ کیا گیا ہو۔۔ اور پھر ہر قسم کے ریشمی کپڑوں کی قیمتیں معلوم ہو گئی تھیں لاہور اور
بمبئی کا موجودہ فیشن معلوم ہو گیا تھا کہ آج کل جالی کا بے حد فیشن ہو گیا ہے، برسوں
ہی کی تو بات ہے جب دسویں کی لڑکیوں کو فیرویل پارٹی ہم لوگوں نے دی تھی۔
اور ہمارے سکول کی ملکۂ حسن قدسیہ موڈ کلر کی ریشمی جالی کی قمیص اور دوپٹہ
پہن کر آئی تھی سفید ساٹن کی شلوار تھی اور اس کا وہ سرخ و سفید رنگ سیاہ
بڑی بڑی چمکدار آنکھیں، سیاہ لمبی لمبی دو چوٹیاں جو شانوں پر ادھر ادھر پڑی
ہوئی تھیں۔ کتنا اچھا کٹ ہے اس کے جسم کا سو پچاس لڑکیوں میں ایک ہی
نظر آ رہی تھی، میں کبھی نہیں بھولوں گی جب وہ میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھی ہوئی
اس کے بڑے بڑے ٹولپس کس قدر چمک رہے تھے اور گوری گوری باہیں
جالی کی فل سلیوز میں سے چھن چھن کر نظر آ رہی تھیں اس کے ہاتھ کتنے خوبصورت
تھے جب وہ سینڈوچز۔۔۔۔۔۔) اٹھا کر سرخ سرخ کاٹتے ہوئے گیلے

گیلے ہونٹوں تک سے گئی تھی۔ لمبی لمبی خوبصورت سفید سفید سی انگلیاں اور ترشے ہوئے لمبے لمبے پینٹ کئے ہوئے سرخ سرخ سے ناخون، کتنی خوبصورت ہے قدسیہ، تبھی تو میں نے اس کا نام ملکۂ حسن رکھدیا۔ جسے سن کر سرخ ہو جاتی ہے اور گردن جھکا لیتی ہے اور پھر تھوڑی دیر میں اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے بناوٹی غصے سے ایسی دیکھتی ہے کہ ـــــــــ نہ جانے اتنی اچھی کیوں لگتی ہے کمبخت۔ روز تو خیر یہی ٹھنی رہتی ہے مگر جس روز ہماری اور اس کی کوکینگ تھی۔ اُس روز تو بھئی غضب کی خوبصورت لگ رہی تھی۔ سفید غرارے کے اوپر سفید ایپرن اور ہیڈ کور میں سے ماتھے پر سیاہ سے بال جو پیچ دار گول گول دائروں کی صورت میں ماتھے پر پڑے ہوتے تھے۔ بالکل نرس معلوم ہوتی تھی۔ ہائے رے کتنا مزا آیا تھا اس روز جب کبھی کبھی یاد آ جاتے ہیں وہ دن تو بس یہی جی چاہتا ہے کہ پھر سے وہی دن آ جائیں۔ وہی بات بات پر قہقہے لگانا فضول باتوں میں گھنٹوں گذر جاتے تھے۔ وہ میری عزیز ساتھنیں۔ مجال ہے جو ایک لفظ میرے منہ سے نکل جائے اور کوئی پورا نہ کرے۔ مگر اس کلاس کی لڑکیوں کی وجہ سے میں نے بھی ہزاروں دفعہ سزائیں اٹھائی ہیں سالانہ امتحان میں جس روز اردو کا پرچہ ہوتا، خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ تین گھنٹے کا پیپر ہوتا اور ہم ایک گھنٹے میں ختم کر کے دوسرا پیپر تیار کر کے پاس کی لڑکیوں کو دیدیتے جو سارے ہال میں باری باری چکر لگا رہا ہے ساری کلاس کے ایک ہی جواب اور سب صحیح کوئی ٹیچر پاس سے گذری اور پوچھا

معلوم دیتا ہے روحہ تم پیپر ختم کر چکی ہو۔ ہم نے ذرا آنکھوں ہی آنکھیں ڈال کر ان کی خوبصورتی کا جائزہ لیتے ہوئے مسکراتے ہوئے جواب دیا ہاں کر تو چکی ہوں، مگر ابھی ریوائز کر رہی ہوں۔ کیا خیال ہے۔ اور وہ زور سے منہ بناتی ہوئی بل کھاتی ہوئی نکل گئی۔ خدا کی قسم فوراً جل جاتی تھی نہ جانے کیوں۔ ہائے اللہ اتنا مزا آتا ہے کسی کو جلانے میں۔ اور پھر ہمارے قہقہے۔ بل کھا کھا کے رہ جاتے ہیں۔ جلنے والے، ان کی جھینپی دیکھ کر بس یہی جی چاہتا ہے کہ منہ چڑاتے ہوئے دور کھڑے ہو کر انگوٹھا چڑا چڑا کر کہیں۔ جلے کو جلائیں گے ——— اور ——— اور حلوا پوری کھائیں گے۔ لڑکیوں کے ساتھ تو اکثر یہی واقعات پیش آتے۔ مگر ٹیچرز کا تھوڑا سا ادب کرنا پڑتا ہے وہ کیوں، اس لئے نہیں کہ وہ ہمیں پڑھاتی ہیں۔ اور بڑی ہیں، استاد ہیں، اونہہ ہرگز نہیں، کبھی بھی نہیں۔ صرف باباجان کے الفاظ عین موقع پر گونجنے لگتے ہیں، کہ روحہ بیٹا، بڑوں کا ادب ضروری ہے اور پھر استاد کا درجہ تو بہت ہی اونچا ہے۔ کوئی شخص اگر الف بھی لکھنا پڑھنا بتائے وہ بھی استاد ہے۔ اف اللہ اور وہ جانے کیا کیا کہا کرتے تھے مگر اس وقت تو صرف اتنا ہی یاد رہا ہے۔ گرہ میں بھی بند ھ سکا۔ جو عین وقت پر تھام لیتا ہے۔ وہ دن تو کبھی نہ بھولوں گی جب، میں تنگ آ جاتی ہوں ان آج کل کے دنوں سے تو بس یہی جی چاہتا ہے کہ بھابی جان کے کمرے میں چپکے سے جا کر ان کے لمبے چوڑے ڈبل بیڈ پہ زور سے چھلانگ لگاؤں نرم نرم گدوں دار بستر میں دھنس جاؤں۔ مگر کمبخت کتنا اباجو ڑا سا ہے

مگر ساتھ ساتھ کتنا نرم اور ساٹن کے گدے جن پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے دل کبھی نہیں اکتاتا اور نیند ناخواندہ مہمان کی طرح ہم پر مسلط ہو جاتی ہے۔ وہی اسکول کے دن یاد آجاتے ہیں جب ہر روز نئی نئی شرارتیں سوجھتی تھیں۔ سچ کہتی ہوں کہ اب تو ہم بوڑھے ہو گئے۔ دانت نہیں ٹوٹے تو کیا۔ سر سفید نہیں ہوا تو کیا۔ ذرا اُٹھا چھائی اور ہم پچھلی طرف چلے گئے ڈالی خانے کے پاس۔ جہاں درخت ہی درخت ہیں ہری ہری گھانس اور رُلا دینے والے کھلے ہوئے گلاب سرخ سرخ' زرد زرد' گلابی گلابی اور اودے اودے گلاب۔ ہم ابھی چھوٹا گیٹ کھول کر اندر ڈالی خانے میں داخل ہی ہونا چاہتے تھے کہ بھائی جان اور بھابی جان مع ریزگاری کے پیچھے سے آتے نظر آئے جان ہی تو چل جاتی ہے۔ سب بچے کھیل کود رہے ہیں۔ ہم نے سوچا لاؤ ذرا ہم بھی ان میں شریک ہو جائیں۔ اور ہم نے چپکے سے ثریا کو اشارہ سے کہا ہم بھی کھیلیں گے۔ اور ان کمبختوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ او جاوید' ثریا رعنا آؤ روحہ آنٹی بھی کھیلیں گی آؤ جلدی ــــــــ اور بھابی جان نے ناز سے کھا نسنا شروع کر دیا۔ روحہ بی بی اب تم بھی کھیلو گی خدایا کچھ تو سوچا کرو۔ اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ جاؤ آج تم نے ذرا بھی نہیں پڑھا ــــــــ نوٹس لکھ لئے۔ ہائے اللہ ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جی چاہا کہ ان کے سر میں لگی ہوئی مشین گنوں کو نوچ ڈالوں۔ بڑی آئی بال گرل کرنے والی خود تو ہر وقت یہی کوشش کرتی رہتی ہیں کہ میں خوبصورت نظر آؤں اتنی بڑی ہو گئیں۔ ابھی فیشن میں کمی نہ آئے اور ہم کھیل بھی نہیں سکتے۔ بھائی جان کے

کہنے پر کہ کھیلنے دو آج موسم اچھا ہے۔ کیا ہوا تو کس انداز سے ان کی طرف دیکھ کر مسکرائی ہیں۔ کہ آپ کی طرح سے اس کا ڈر بھی بچوں پر نہیں رہے گا۔ جب یہ عوران سے ساتھ کھیلے گی۔ آپ کا کونسا رعب ہے بچوں پر دیکھئے گا ابھی سب بچے آپ کے پاس آئیں گے کہ پاپا جان آپ کھیلئے ہمارے ساتھ۔ بھلا مجھ سے تو کوئی کہہ کر دیکھے۔ میرا جی چاہا کہ زور سے کہوں۔ جناب کا کیا خاک رعب ہے۔ ابھی اگر بچوں کو روحہ آنٹی کا حکم ملے کہ بچو پلٹ مارچ کرتے ہوئے اپنی جلاد ممی پر چڑھائی کر دو تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آڑے وقت میں ما بدولت ضرور کام آئیں گے۔ جو ممی جان کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہیں۔ وہ تو نہ جانے کیا سوچ کر رہ جاتی ہوں۔

بھابی جان کا یہ لمبا چوڑا پلنگ کتنا اچھا لگتا ہے۔ نرم نرم گدوں میں لپٹی ہوئی دھنسی ہوئی بے بس سی۔ زندگی کی تصویریں موت کا عکس، ہائے اللہ کتنے بڑے دن ہیں پہاڑ سے دن جو کاٹے نہیں کٹتے۔ کتنے اچھے دن تھے وہ۔ جی چاہتا ہے پھر وہی دن آ جائیں۔ وہی بات بات پر قہقہے، وہ دن کبھی نہ بھولوں گی، ہاں شاید جمعہ تھا اس روز ہماری کوکنگ تھی۔ مسز شاغل نے بلو برڈ کی سٹوری ختم کرتے ہوئے گھڑی دیکھی ان کی چھوٹی چھوٹی سیاہ چمکدار نگاہیں گھڑی کی سوئیوں پر تھی اور ادھر ٹن ٹن گھنٹی بجی۔ خدا خدا کر کے وقت ختم ہوا، مگر ہمارے گروپ کی لڑکیوں کے چہروں پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہائے اللہ روحہ کچھ کرو، بتاؤ

کوئی ترکیب، غضب ہے۔ کسی کو یاد نہیں رہا کہ آج کو کنگ ہے کوئی بھی چیز سے اپنی ایپرن نہیں لائی۔ اقبال نے اپنی گول گول آنکھیں پھراتے ہوئے ڈرتے ہوئے چہرے سے مجھے دیکھا۔ اوہو مہاراج کی بات سنی؟ مہارانی جی ہمیں تو خیال نہیں رہا بس اتنی جلدی آگئی تھی۔ اس کا ثبوت ہے یہ میرا کنگھا، چوٹی بھی نہیں گوندھی یہ کہیئے آپ، کہ یہ دو چوٹیاں گوندھنے میں جو وقت ضائع کیا، اس عرصے میں سینکڑوں چیزیں یاد آسکتی ہیں۔ کیوں ہے نا فیروزہ نے اپنی ناک کا ایک سرا اونچا کرکے مٹکتے ہوئے جملہ پورا کیا۔ اور داد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگیں، مگر صاحب ہم کوئی ایسے خطرناک موقع پر لڑائی کروانا چاہتے تھے کبھی نہیں ہوتے دیتے سب کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہوئے ڈانس کرتے ہوئے کہا۔ عادت ہے تمری کھراب برا نہ مانو، سمجھیں۔ لڑنا کھراب بات ہے۔ اب فکر کرو۔ کہ ہم ـــــ کتنی لڑکیاں ہیں ہمارے گروپ میں ایک دو تین چار، چار اور چار آٹھ ہوں ہوں، آٹھ لڑکیاں اور ایک ایپرن اور جس کا ہیڈ کور بھی نہیں تھا۔ بھلا ڈانٹ کھانے کی بات تھی نا۔

اب جو ہم نے پلٹ کے دیکھا تو ساری کلاس کی لڑکیاں غائب اب میں تھی اور سات یتیم بچے جن کے منہ کھلے اور ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ سب سے پہلے میں اس کی انگلی پکڑ لوں۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آتا تھا کہ کیا کریں، آخر ہم نے ایک عدد ٹرے کیتلی اور دو پتیلیوں پر ہی اکتفا کی۔ اور اور سب لڑکیوں کو ساتھ لئے جلدی

جلدی میز کے پاس پہنچی میز پر گرد جمی ہوئی تھی۔ آٹھوں لڑکیوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا مگر ہر ایک اپنے اردگرد دیکھ کر اور نیلے کالے کاسنی اودے سلیٹی عنابی چھنے ہوئے دوپٹوں کے پلو پکڑ پکڑ کر آہستہ سے چھوڑ دیئے۔ آخر ہم نے جھاڑن کا کام اپرن سے لیا۔ اور میز صاف کرنے لگی۔ صادقہ کو پیالہ دے کر بھیجا کہ جاؤ جہاں دودھ بٹ رہا ہے۔ اس پیالے ہیں لے آؤ۔ اقبال کو ٹوکری دی کہ کچھ ٹلے لائے۔ فیروزہ کو سبزی دی کہ دھو کر کاٹو۔ عزیزہ کو کاغذ لانے کو بھیجا حمیدہ کو برتن دھونے کو بھیجا۔ ہم ابھی میز صاف کر ہی رہے تھے کہ عزیزہ ناک سکیڑتی ہوئی ہاتھ ہلاتی ہوئی ناکام واپس آئیں۔ ہماری جان ہی تو جل گئی۔ خیر اپنی قسمت کو کوستے ہوئے برابر کی لڑکیوں کی میزوں کو حسد بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جن کی میزوں پر تازے تازے اخبار بچھے ہوئے تھے۔ ہم اپنی غریب میز کو دھوبی کے دھلے ہوئے اپرن سے صاف کرنے لگے۔ مجبوری کیا کرتے۔ ہمارے گروپ کی لڑکیاں تھیں اور فیشن تھا، ان کو اپنے بننے سنورنے ہی سے فرصت نہ تھی۔ آخر میں اکیلی کیسے کرتی۔ میں جل رہی تھی اور میری ساتھنیں مسکرا رہی تھیں، کچھ کھڑی ہوئی لمبی سیاہ رہ چوٹیوں میں گرہیں لگانے پر مجبور تھیں۔ عقیلہ اپنا بھاری جسم چھوٹی چھوٹی ٹانگوں پر بمشکل اٹھائے کمرے میں داخل ہو سکی سانس بری طرح سے پھول رہا تھا۔ اس حالت پہ بھی خیر سے انہیں غصہ آ رہا تھا۔ اے لو روحہ غضب کر دیا ابھی جناب میز ہی صاف کر رہی ہیں

اور رشیدہ کے گروپ کی تو آگ بھی جل گئی۔ فیروزہ نے گیلے ہاتھوں کو ہمارے سفید سے ایپرن سے جو آپ ہی کہیں کہیں سے کالا ہو گیا تھا۔ میز صاف کرنے سے پوچھنا شروع کر دیا اور بڑی بڑی آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا، واہ واہ خوب ماروحہ آخر تم اس قدر سست کیوں ہو گئی ہو۔ میں سبزی بھی دھو لائی اور جناب ابتک میز ہی نہیں صاف کر چکیں۔ یعنی عجیب ہو تم بھی۔ اور ہم نے ٹالتے ہوئے کہا اوہ ابھی تو ابتدا ہے مگر نہیں صاحب اقبال کب چپ رہنے والی تھی، اوہو بڑی آئیں ابتدا کرنے والی، سب کا پک کر تیار بھی ہو جائے گا۔ اور ان مہارم کی ابھی ابتدا ہوئی۔ اوہ ابتدا، ساری شاعری آج چولے ہی کے پاس ختم ہو جائے گی۔ اچھا جی۔ اور ہم نے دور سے اپنی کوکنگ ٹیچر مس حمیدہ کو آتے ہوئے دیکھا۔ مگر وہ دوسرے گروپ کے پاس کھڑی زور زور سے کچھ کہہ رہی تھی مگر میت دور ہم تک صرف بھنبھناہٹ ہی پہنچ سکی۔ اور ہم نے ذرا آہستہ سے اپنے ماحول سے تنگ آکر گنگنانا شروع کر دیا۔ ہماری سمت آنا اچھا جی اور اب سب ہمارے ساتھ مل گئی تھیں۔ بے سری آوازیں بھی اس خوشی میں شریک تھیں۔ بالکل چھوٹا سا جشن ہو رہا تھا۔ بہ نسبت اور گروپس کے وہاں تو چیخم دھاڑ مچ رہی تھی۔ ہمارے اچھا جی یہ ساری لڑکیاں زور سے ہنس پڑیں۔ ابھی قہقہے آدھے بھی نہیں ہوئے تھے کہ خدا کے لئے چپکی رہو صادقہ کی آواز سنائی دی۔ جو کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ مع برتنوں کے ایک

ٹوکرے کے ہمراہ، ہماری جان میں جان آئی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک کاریگر
تو آیا۔ نہ چمچہ تھا نہ چھری تھی نہ اور کوئی دوسرے برتن تھے۔ اب سوال یہ پیدا
ہوا کہ پکائے کون۔ یہ سن کر سب ہنسنے لگیں یہاں خیر سے سب صفر ہی تھے۔
آخر سب چلا اٹھی تھیں روحہ کو پکانا آتا ہے۔ کیونکہ یہ ابھی دوسرے گروپ کی
لڑکیوں سے کہہ رہی تھیں کہ پہلے سبزی رکھو۔ ہم اپنی اصلیت کو اپنے دل میں
محسوس کرتے ہوئے دل ہی دل میں جھینپ رہے تھے۔ مگر خاموشی اس
وقت ساتھ دے گئی۔ اگر ذرا بھی بولتے تو ساری شیخی کرکری ہو جاتی۔ معاملہ یہ
تھا کہ چلتے وقت تھیلے میں کاپی رکھ لائی تھی۔ جو معلوم تھا کہ ضرور کام آئے گی
بیچاری غریب قمر اس اثنا میں کوئلے کی ٹوکری اٹھائے دونوں ہاتھ سخت کالے
اور ناک اور گورے گورے رخساروں پر نظر بد کے نشان لگائے داخل ہوئیں
گویا ہنسی کا مرقع۔ ہم میز صاف کرتے کرتے میز پر جھک گئے کیا کرتی اور ہنسی
رکتی ہی نہ تھی، اور ڈر تھا کہ شور نہ ہو۔ ایک دفعہ ہی عزیزہ ہنستے ہوئے ہم
پر آن پڑی اور عزیزہ پر حمیدہ۔ اور اقبال ہائے رے قمر ہنستے ہنستے غریب
موٹی عقیلہ اور حمیدہ پر آن پڑیں ایک پر ایک، اور ہنسی کی عجیب قسم آوازیں
بمشکل روکنے پر بھی نکل رہی تھی۔ جیسے کسی کتے کی آواز کا ریکارڈ لگا دیا
جائے۔ اور اس کی اسپیڈ کم ہو گئی ہو۔ چابی کی کمی کی وجہ سے عجیب عجیب
سی آوازیں تھیں۔ جن کو سن سن کر اور بھی ہنسی آ رہی تھی۔ ہمارا برا حال تھا۔

دبلی پتلی موٹی موٹی ساری کی ساری ہم پر لدی ہوئی تھیں۔ پسینے کے مارے برا حال تھا فیروزہ دروازے کا سہارا لئے منہ کھولے بے تحاشہ ہنس رہی تھی ناک کے نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ صرف صادقہ ہی ایک امن پسند لڑکی تھی جو کبھی ہنستے ہنستے بے دم ہو جاتی تھی اور کبھی کبھی نصیحت بھی فرمانے لگتی۔ خیر خدا خدا کر کے قمر کو احساس ہوا۔ اور وہ بھاگتی ہوئی ہماری نظروں سے غائب تھی۔ اب جو پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو ہماری ڈومیسٹک سائنس کی ٹیچر حمیدہ عارف ہمارے پیچھے کھڑی تھیں۔ چلئے اندھے ــــــ سب کی نظریں ڈومسٹک سائنس کے کمرے کی طرف اٹھیں۔ وہاں کا نقشہ ہی پلٹا ہوا تھا۔ ہر ایک لڑکی منہ پر انگلی رکھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں ــــــ چہرے ہنسی کو ضبط کرنے کی وجہ سے سرخ ہو گئے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ ہم ہی نہیں سب ہی لڑکیاں شور مچا رہی تھیں۔ جس کی سزا یہ ملی ہم بھی اپنے تیمیم بچوں کی انگلیاں پکڑے کمرے میں تھے۔ اس جرم کی رہائی اس پر تھی کہ جب تک دودھ نہ آئے ساری لڑکیاں بھی خاموش کھڑی رہیں۔ ہم نے سب سے کہا کہ ایک ایک لڑکی خدا سے دعا مانگے اور گھر جا کر ایک ایک بھوکے فقیر کو کھانا کھلائیں۔ سب کے منہ کھلے ہوئے تھے ارے پکانا تو آتا نہیں اور جناب مولانا فرما رہے ہیں کہ ایک بھوکے فقیر کو کھانا کھلاؤ، ہمارے بس کی بات نہیں رہی دعا تو وہ مانگے لیتے ہیں اور

سب کے لب تھرتھرانے لگے۔ ارے میں نے چیخ کر کہا۔ تم لوگ نوحہ کرتی ہو کوئی بھی سیریس سی دعا مانگ رہا ہے۔ ہنسی کے مارے تمہاری روح تڑپ رہی ہے۔ اوہو۔ اگر ایسی دعائیں بارگاہ عالی میں قبول ہونے لگیں تو جناب آج ہم یہاں حمیدہ عارف کی دھونس میں سزا میں کھڑے رہتے چھوٹے بچوں کی طرح قسم قسم۔ اور قدسیہ نے منہ چڑاتے ہوئے حمیدہ عارف کی پیٹھ کو غور سے دیکھا جو بہت دور ہماری طرف سے پیٹھ کئے کھڑی تھی ـــــ دیکھا انہیں اتنی فرصت مل جاتی ہے کہ اپنی شمیز میں کیسی اچھی کروشیہ کی بیل بناتی ہے۔ اور ہمارے اسکول کی رمولا نے اپنی دونوں چوٹیوں میں گرہ لگاتے ہوئے کہا۔ سفید وائل کے ٹائٹ بلاؤزیں سے جھکتے ہوئے کروشئے کے بنے ہوئے اسٹریپس۔

ارے میری دعا قبول ہوئی صادقہ نے ناز سے مسکراتے ہوئے کہا جیسے انہی کی دعاؤں کا یہ اثر ہے جو چپراسن دودھ کی بالٹی لئے ہوئے آ رہی تھی۔ اونھ میں نے منہ چڑا دیا ـــــ اور صادقہ کی آنکھیں چمک رہی تھیں جیسے وہ مجھے بیوقوف سمجھ رہی تھی ـــــ اب ہم سب پھر اپنی میز کے پاس تھے۔ جلدی سے عزیزہ نے انگیٹھی سلگائی۔ اور ہم نے جلدی سے کتاب دیکھی معمہ حل ہو گیا۔ اتنے میں کتاب کے اور بھی گاہک پیدا ہو گئے۔ فاطمہ، زبیدہ، امتہ السلام وغیرہ۔ خیر ہم نے سب کو پکانے کی

ترکیب بتا دی اور اب ہم ایک اچھے باورچی کی حیثیت سے اکڑتے ہوئے
انگیٹھی کے پاس آ بیٹھے۔ معاملہ تیار تھا۔ سوجی چینی ملا کر دیگچی چڑھا دی۔
ایک دفعہ ہی ہم پر بوچھار شروع ہو گئی۔ کیوں کیوں؟ ہائیں ہائیں! ارے؟
کیا کر رہی ہو؟ ارے بھئی پانی تو ڈالو ——— مشہور مشہور ڈائرکٹرنیں اپنی
اپنی رائے دے رہے تھے۔ ہم مسکین صورت بنائے بات ٹالنے کی کوشش
کر رہے تھے۔ مگر صاحب۔ سب بے سود ——— ہمارے گروپ کی
ساری لڑکیاں دوسری میز کی لڑکیوں سے پوچھ رہی تھیں۔ ہمیں بہت ہی
ہنسی آئی کہ یہ سب ہم ہی سے تو پوچھ کر گئی تھیں۔ سب واپس کھسیانی
بلیوں کی طرح آئیں۔ ہائے رے روحہ۔ کی بچی تم نمبر کٹواؤ گی۔ فیروزہ اپنی
چھوٹی سی کھلی ہوئی چٹیا کو پیٹتے ہوئے کہا۔ ہم جل ہی تو گئے۔ تو جناب آپ
خود ہی پکا لیں۔

آخر میں اتنی محنت کر رہی ہوں۔ کیا ہی صلہ ملا ہے اس کا۔ اچھا اچھا تم
کام کرو ورنہ بکنے دو انہیں صادقہ نے ہماری صفائی کراتے ہوئے۔ آہستہ
سے کہا اور فیروزہ کو گھورنے لگیں۔ ہم نے پھر کام شروع کر دیا اور اب دوسری
چیز تیار کرنے لگے۔ یعنی سبزی کا شوربہ۔ صادقہ کو پالک کترنے کو دیا۔ اور
فیروزہ کو آلو اور ہم کتری ہوئی پیاز کو تل پر سے کر گئے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ
قمر صاحبہ اطمینان سے دوسرے گروپ کی لڑکیوں کے سامنے فیشن کے بارے

میں دھواں دھار تقریر کر رہی تھیں ہماری جان ہی تو جل گئی۔ ہم تو جب سے کام کر رہے ہیں اور آپ کو فرصت کا وقت ملا ہے بحث کرنے کے لئے، کام ہم کریں اور نام سب کا ہو ہمارا جی جل گیا کہ ہم بھی نہ کچھ کریں۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ بڑی آئیں کہیں سے اور میں گھورتے ہوئے خون کے گھونٹ پیتی ہوئی کمرے میں واپس آئی۔ خیر خدا کا شکر کہ ہماری ساری چیزیں یعنی سبزیاں وغیرہ دیگچیوں میں تھی، گویا بہت بڑا کام ختم ہوا، ابھی ہم اپنا پسینہ پونچھ کر انگیٹھی کے پاس سے اٹھے ہی تھے۔ کہ صادقہ دودھ کا پیالہ لئے پیشانی پر ہزاروں بل پڑے ہوئے تھے۔ اور ہانپتی ہوئی داخل ہوئی اور میز پر زور سے پیالہ رکھا جس سے ہماری سفید اپرن سے صاف کی ہوئی میز پر دودھ ہی دودھ تھا ــــــ ہم سب یکدم چیخ اٹھے خیر تو ہے، بھئی کیا ہوا۔ ارے! ہائے ہائے غضب ہو گیا اور سارا دودھ گر گیا۔ نہیں نہیں تھوڑا سا باقی ہے، یہ تھی چیخ پکار جس کو سن کر اور اس عجیب واقعہ سے ہم اور بھی گھبرا گئے ــــــ اور سب کی نگاہیں صادقہ کے پاؤں پر تھیں۔ مگر خاصہ گورا چٹا پاؤں تھا۔ چوٹ وغیرہ تو کہیں بھی نظر نہیں آتی تھی پھر یہ پاؤں کیوں پکڑے ہے۔ آخر ہم نے جھک کر پوچھا۔ بھئی خیر تو ہے کیا ہوا۔ کچھ۔ تو بتاؤ، کچھ منہ سے بولو سر سے کھیلو آخر یہ اٹوائی کھٹوائی لے کر کیوں بیٹھی ہو (لیٹی نہیں) اور صادقہ نے بڑی بڑی معصوم آنسوؤں سے لبریز نگاہوں سے ہمیں دیکھتے ہوئے کہا۔ آپ سب

تو مزے سے میز پر چڑھی بیٹھی ہیں اور ہم جب سے کام کر رہے ہیں۔ معلوم ہے دودھ لیتے وقت کتنی تکلیف اٹھانی پڑی لڑکیاں وارہی نہیں دیتی تھیں جو ہے وہ سب سے پہلے لینا چاہتی تھی۔ اس کی گواہی۔ یہ ہمارے دوپٹے کا پلو دیکھو۔ کتنا پھٹ گیا ہے' چہ چہ ہم نے ہمدردی جتلاتے ہوئے انگلی سے پاؤں کی طرف اشارہ کیا اور صادقہ، ہر مصیبت دشمنوں کے گلے اس پاؤں میں کیا ہوا۔ اونھ۔ کیا ہوا میرا تو آج جتنا نقصان ہوا ہے وہ میں ہی جانتی ہوں دیکھو یہ ننھی چپل اس کا اسٹیپ ٹوٹ گیا۔ اب میں کیا پہنوں گی' اور گھر کیسے جاؤں گی خوب صاحب خوب اچھا پکایا' اور وہ منہ کھولے تیوری پر بل چڑھائے باہر دیکھتے ہوئے چیخی اوہ ارے غضب مس عارف آ رہی ہیں ارے میز پر سے دودھ تو صاف کر دو ــــــــ ارے واقعی، کپڑا دو ــــ ارے کوئی کاغذ ہی لے لو۔ جلدی کرو ارے وہ اب آیا ہی چاہتی ہیں۔ بھئی کھڑی کھڑی کیا دیکھ رہی ہو۔ وہی ایپرن لے لو۔ ٹھہرو ٹھہرو۔ ہم جلدی سے میز کے کنارے کے پاس پیالہ لگا دیا۔ اور سارا میز کا دودھ جو اب مٹیالہ سا ہو گیا تھا پیالے میں آ گیا۔ ارے۔ یہ کیا۔ ارے سفید باقی دودھ کو بھی کالا کر دیا۔ اور تم نے یہ کیا کر دیا۔ اور صادقہ ایک چھلانگ لگاتی ہوئی ہمارے پاس آئیں ــــــ بھئی ہم نے بیوقوفی نہیں کی دودھ کم ہو گیا تھا۔ اور کہاں سے ملتا۔ اوئی۔ ہائے ارے اوہ ۔ ۔ ۔ ۔ آ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ متفرق بجیب تھیں جنہوں نے ہمارے رہے سہے

اوسان بھی ختم کردے۔ کیا ہے بھئی خدا کے لئے ذرا آہستہ بولو اس قدر چیخ کیوں
رہی ہو۔ اور ہم نے مڑ کر دیکھا تو تیز دہکتی ہوئی انگیٹھی ہمارے قریب الٹی پڑی
تھی۔ جس پر ہم ابھی دودھ ابالنے والے تھے ارے جلدی کرو۔ ارے مس
عارف۔ دوسرے گروپ کے پاس کھڑی ہیں اب ادھر بھی آنے والی ہیں
ارے مس عارف سب زور زور سے چیخ رہی تھیں اور کام کوئی بھی نہیں
کرتا تھا۔ ہم نے جلدی سے چینی کی پلیٹ اور چمٹے کی مدد سے دہکتے ہوئے
انگارے انگیٹھی میں واپس ڈالے اب چھوٹے چھوٹے کوئلے باقی
رہ گئے تھے۔ اور گرم گرم راکھ تھی۔ ہم نے سوچا تھا کہ اس کو اٹھانے میں تو دیر
لگے گی اسے جھاڑو سے صاف کر دیں گے اور ذرا سبزی کے شوربے کی دیگچی
رکھ دیں نہیں تو ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اس کا ڈھکنا بھی غائب ہو چکا تھا نہ
جانے کہاں۔ ہم اٹھا کر میز پر سے ایک پلیٹ لائے اب جو لڑکیوں پر نظر
پڑی تو کسی کو ہوش نہیں۔ اور دبے دبے قہقہے کوئی اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونسے
پیٹ ایک ہاتھ سے دبائے جھکی جا رہی ہے سب کے منہ سرخ ہیں آنکھوں
میں آنسو جھلملا رہے ہیں ــــــ سب کا ہنسی کے مارے برا حال
تھا۔ مگر ہماری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا آخر صادقہ نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے نتھنے
پھلاتے ہوئے دیگچی کی طرف اشارہ کیا۔ ہم نے جو جھک کر دیکھا تو دیگچی کی ملگجی
سے پانی کی سطح پر کالے کالے ننھے ننھے کوئلوں کے ذرے تیر رہے تھے۔ یہ کسی

نے کیا۔ ہم نے غصّے سے پوچھا۔ یہ ـــــ یہ میں نے ـــــ کیونکہ میں سمجھی کہ انگیٹھی پر ابھی دیگچی نہیں رکھی ہے۔ بس سارے کوئلے چن چن کے ڈالدیں اب جو میری رکابی دیگچی سے ٹکرائی تو میں نے دیکھا کہ انگیٹھی کے اوپر دیگچی رکھی ہے مگر ساری راکھ اور کوئلے دیگچی میں گر چکے تھے۔ اب پھر سب کا برا حال تھا ہم نے کہا بھئی آج تو خدا ہی کرے تو خیر ہو۔ نمبر تو گئے۔ سب سے پہلے کسی کے پاس ایپرن نہیں۔ صادقہ کی چپل ٹوٹی اس غریب کا دوپٹہ پھٹا اور ساری میز پر دودھ گر گیا۔ پھر انگیٹھی گری۔ اور اس کے بعد یہ کہ سبزی کے ہرے رنگ میں سیاہی مل گئی۔ بھلا مریض کیا اس کھانے کو کھا کر زندہ رہ سکتا ہے۔ ہم ابھی یہیں تک کہنے پائے تھے کہ مس عارف کی ساڑھی کا سرخ بورڈر نظر آیا۔ اور ہم نے انگلی سے سب کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اب سب کی ہنسی ختم ہو چکی تھی۔ مگر اپنی اصلی حالت میں ابھی کوئی نہ تھا۔ مگر مس عارف ہمیں مسکراتی ہوئی گہری گہری نظروں سے دیکھتی ہوئی پاس سے نکل گئیں سب نے خدا کا شکر ادا کیا مگر ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ ان کی مسکراہٹ اور ان کی اس گہری نظر میں کچھ پوشیدہ ہے۔ ہم نے دیگچی اتار کر سبزی کا عرق نکالا، چائے بنائی اور سارا دودھ سبزی کے عرق میں ڈال دیا۔ کیا کرتے۔ راکھ اور کوئلے کی سیاہی کو بھی چھپانا تھا ـــــ

ساری لڑکیاں کمرے میں تھیں، مس عارف ہر ایک کی چیزیں دیکھ رہی

تھیں ہم سب کے دل دھڑک رہے تھے۔ روحہ تمہارا شور بہ بہت خراب ہے۔ مریض ایسا شوربہ پی کر ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور جس روز آپ کی کوکنگ ہو آپ لوگ شلواریں پہن کر آئیں کیونکہ غرارہ پہننے سے اور پھر بدحواسی سے بھاگنے سے ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ تو خدا نے بچا لیا کوئی جلا نہیں۔ اور وہ مسکرا کر دوسرے گروپ کی چائے کو چکھ رہی تھیں ہمیں ایسا معلوم ہوا کہ پسینہ میں ہم ڈوب گئے ہیں دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اوہ روحہ۔ ارے بھئی خدا کے لئے شام کے چھ بج گئے اور تم اب تک سو رہی ہو کس قدر کاہل ہو گئی ہو۔ میں تم کو کچھ نہیں لے جا سکتی تم ابھی تیار بھی نہیں ہو۔ اور بھابی جان سینٹ میں بسی ہوئی۔ پیلے ربن اپنی دو چوٹیوں میں باندھ رہی تھیں۔ ریشمی پیلا غرارہ اور ہلکے پیلے رنگ کی جالی کی فل سلویز کا کرتہ۔ کس قدر خوبصورت کتنی حسین معلوم ہو رہی تھیں۔ سیاہ کرل سے بال جو دو حصوں میں ریشمی چمکیلے ربن میں بندھے ہوئے دونوں شانوں پر پڑے ہوئے تھے۔ بھینی بھینی سینٹ کی خوشبو کار کا ہارن زور سے بجا۔ "اچھا" ٹومٹس" بھابی جان نے چیخ کر بھائی جان سے کہا جو باہر کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کی ریز گاری بنا نہیں پکڑ لیں اور ان کے پروگرام کی تنہائی ساری تباہ ہو جائے۔ میں نے جل کر کروٹ لی۔ بھابی جان کے لمبے چوڑے نرم نرم ڈبل بیڈ پر میں کسمسا کے رہ گئی۔ بھابی اب آئینہ میں اپنا غازہ درست کر رہی تھیں تاکہ رخساروں کی

زردی شہابی رنگ میں تبدیل ہو جائے۔ اچھا رد حہ تم کل چلی جانا ان سب بچوں کے ساتھ۔ دیکھو ان نالائقوں کا خیال رکھنا۔ بے بی کو ساڑھے سات بجے دودھ بنا کے دیدینا۔ اور وہ لپ اسٹک درست کرتی ہوئی کمرے سے بھاگ گئیں۔ اور موٹر اسٹارٹ ہوئی اور ایک سنسناہٹ سی چھوڑتی ہوئی کب کی جا چکی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نہ وہ اب اسکول کا زمانہ تھا۔ نہ وہ معصوم سی ساتھنیں نہ وہ بات بات پر قہقہے۔ اب تو ان قہقہوں کی جگہ آنسوؤں نے لے لی تھی۔ میں نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا سونے کی وجہ سے آنکھیں ہلکی ہلکی سُرخ ہو گئی تھیں۔ اور اب رونے سے پلکیں بھی بھیگ گئی تھیں میں نے کمرے کی بتی بجھا دی اور ڈرائنگ روم میں ریڈیو کھول کر بیٹھ گئی۔ سنہری سی روشنی میں کھر کھر کے بعد ایک سنسناہٹ کے ساتھ سریلے نغمے اُبل پڑے۔ میں نے پنکھا اور بھی تیز کر دیا تھا کیونکہ میری قمیص پسینے میں بھیگ گئی تھی اور میری آہ نکل گئی۔ ریکارڈ بج رہا تھا۔ "پردیسی ای ای کیوں یاد آتا ہے؛ جب بیتے دن یاد آتے ہیں۔ پردیسی ای ——

اور میں نے سنا کہ برآمدے میں ریزگاریاں آپس میں لڑتے ہوئے، ممی۔ پاپا جان کو آوازیں دے رہے تھے میں نے ریڈیو کی والیم تیز کر دی۔ جب بیتے دن یاد آتے ہیں ——

مس صاحبہ منشی فاضل ـــــ زندہ آباد

V. Nice.

You are fool

90/100

تم کو خبر ہونے تک ....؟

Excellent.

10/100

مس صاحبہ نقل پوش کی جیسے

سب کچھ وہی، کمرہ وہی، چھوٹی سی میز، کپڑوں کی الماری۔ کتابوں کی الماری
وہی نیلا سا چھوٹا سا کمرہ۔ کونے سے لگا ہوا نرم سا پلنگ۔ سب کچھ وہی ہے
مگر اس میں زندگی نہیں۔ مردنی سی چھائی ہوئی ہے۔ جیسے ابھی ابھی کسی
کا جنازہ یہاں سے اٹھا کر لے گئے ہوں —— جیسے بہت ہی شور کے
بعد تھوڑا سا سکون مل جائے —— ایک قسم کی سائیں سائیں سی
سنسناہٹ سی۔ کانوں کے قریب سیٹیاں سی بجاتے ہوئے ہواؤں
کے جھونکے۔ جیسے اس پڑی ہوئی چک سے ٹکرا کر بھاگ رہے ہوں۔
سیدھے۔ نیلی سی لمبی چوڑی سڑک کو پار کرتے ہوئے اس باغیچے کے
لمبے لمبے درختوں میں چھپے ہوئے پرندوں سے سرگوشیاں سی کر رہے

ہوں۔ باغیچے کے پیچھے کھیتوں سے واپسی پر نکھر تھراتے ہوئے گیت دھندلے سے سرمئی آسمان کی اداس اداس سی فضا میں تیرتے جا رہے ہیں۔ دور کھیتوں سے ملی ہوئی زمین اور آسمان اسی شام کے دھندلکے میں شرماتے ہوئے ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں۔ گرم زمین کے رخسار آسمان نے ٹھنڈی ٹھنڈی بھیگی ہوئی سرمئی سی چادر سے ڈھانپ دیئے۔ اس شام کے اداس دھندلکے میں سر جھکائے ہوئے خاموشی سے بیل آہستہ آہستہ ایسی اداس سی گھنٹیاں بجاتے چلے آ رہے تھے۔ جیسے جنازے جا رہے ہوں مرگھٹوں پر ——

اُف یہ شام کس قدر افسردہ ہے۔ اور پھر یہ زندگی اداس و افسردہ سی جیسے دبے دبے گھٹے گھٹے سے سانس مجبوراً لے رہی ہو۔ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اب آہیں کیوں بھرنے لگیں۔ ہرے بھرے کھیت۔ وہ پھولوں سے بھرا ہوا باغیچہ اب سیاہ سی چادر کیوں معلوم ہونے لگا۔ یہ ساکت سے اونچے اونچے درخت۔ جیسے ٹہنیوں میں اب جان ہی نہیں۔ ان اونچی نیچی سیاہ گھاٹیوں کو طے کرتے ہوئے گوالے کیسے رنجیدہ سے سروں میں گاتے ہوئے جا رہے ہیں —— جیسے اس تاریکی میں سیاہ سی گھاٹیوں میں اب یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو جائیں گے —— کمرے کی الماریوں پر پڑے ہلکے نیلے

پردوں پر مٹیالی سی گرد کی تہ جم گئی ہے ——— باریک مٹیالا سا پردہ جو بغیر ڈالے ڈل گیا ہو ——— مگر اب اس کمرے میں اتنی اُداسی کتنی خوفناک سی سرسراہٹ ہے ——— جیسے پردوں سے گلے ملتی ہوئی۔ کمرے کے کونے کونے سے کوئی بچھڑی ہوئی روح خاموشی میں سرگوشیاں کر رہی ہو ——— کوئی چلتے چلتے جیسے رک جاتا ہے — ہائے کتنا عجیب ہے یہ کمرہ ——— یہ وہی چھوٹی سی میز اور کرسی ہے جہاں صہیب پریشان سے بال کئے ہوئے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات کو اپنی چمکدار۔ خوبصورت بوجھل سی آنکھوں سے گھورا کرتا تھا۔ ——— صہیب ——— ان ہی کا یہ بستر ہے۔ نرم نرم سا۔ نیلا پلنگ پوش جیسے وہ ابھی ابھی اٹھ کر کہیں باہر گیا ہے اُسی طرح پلنگ پوش پر پڑی ہوئی سلوٹیں ——— جیسے ابھی ابھی تڑپ کر سو گئی ہوں۔ پلنگ کے نیچے ایک درجن کے قریب جوتے جن پر مٹی کی گرد کی تہیں جم گئی ہیں۔ سامنے اس میز پر رکھی ہوئی خوبصورت سی چمکدار فریم میں چغتائی کی بنائی ہوئی تصویر۔ وہی غالب کے مشہور شعر کا عکس ——

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اس سہ رنگی تصویر پر بھی مٹی نے باریک سا پردہ ڈال دیا۔ جیسے ۰۰

بھی صہیب بھیا کے جذبات کو عریاں نہیں ہونے دینا چاہتی تھی، کس قدر خاکساری ہے ـــــ مگر صہیب۔ کس قدر عجیب ہیں کتنے غمزدہ۔ کاش میں ان کا غم کم کر سکتی ـــــ آج سے پانچ سال پہلے۔ ایسی ہی شام آئی تھی، اداس سی شام۔ جب میں شاہ رخ، اور رخسانہ کے ساتھ سیر کر کے واپس آ رہی تھی ـــــ کتنا اندھیرا ہو گیا تھا ـــــ اور سردی بھی کس قدر تھی۔ جیسٹر لپیٹے ہوئے تھی مگر کانپ رہی تھی ـــــ کتنی گھبرا رہی تھی۔ چاروں طرف، کھیتوں کی پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے ہم سیدھے اپنے باغیچے کی طرف سے آ نکلے ـــــ سامنے برآمدے میں جیسے ہی میں نے قدم رکھا۔ اس اندھیرے میں صہیب کرسی پر پریشان بال کئے ہوئے بیٹھے تھے ـــــ چمکدار آنکھوں میں شاید آنسو بھی تھے۔ کتنا مرجھایا ہوا سا چہرہ تھا ـــــ وہ چپکے بیٹھے ـــــ سرمئی سے آسمان کو گھور رہے تھے ـــــ میں حیران تھی آخر یہ اس سردی میں کیوں باہر برآمدے میں بیٹھے تھے ـــــ نہ جانے کیوں میں انہیں دیکھکر مسکرا دی تھی ـــــ مگر ـــــ وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے ـــــ نہیں گھور رہے تھے۔ پھر اپنے ہونٹ دانتوں سے دبانے لگے تھے ـــــ میرے دل میں کسک سی ہونے لگی

تھی ——— جیسے کسی نے میری بہت ہی قیمتی چیز چرالی ———
جیسے کسی بہت ہی بڑے صدمے سے میں بے قرار سی ہو گئی ۔۔۔۔
مگر وہ پھر اس گھٹا آلود آسمان کو گھورنے لگے تھے ——— میں
آہستہ آہستہ برآمدے سے اپنے کمرے میں گھس گئی ——— جہاں
اندھیرا ہی اندھیرا تھا ——— میں نے ٹٹول ٹٹول کر سوئچ دبایا ـــ
ایسی روشنی ہوئی، ہلکی نہ ر زرد سی سنہری روشنی کمرے میں جھلملا رہی
تھی۔ مدھم زرد سی روشنی۔ دل گھبرانے لگا تھا۔ میں نے کھڑکی کھولی تو باہر
گھٹاؤں سے گھرا ہوا آسمان رو رہا تھا۔ کتنی افسردہ تھی وہ شام ———
صہیب کتنے اداس تھے۔ نہ جانے انہیں میں آج تک نہ سمجھ سکی۔ کبھی
کبھی وہ میرے کتنے قریب ہو جاتے ہیں ——— اور کبھی کبھی کتنے
دور ——— جیسے وہ مجھے پہچانتے بھی نہیں۔ مگر مصر جاتے ہوئے
میری میز پر رکھی ہوئی میری تصویر بھی اُچکا کر لے گئے تھے۔ اور میں
خاموشی سے سارے گھر میں ڈھونڈھ کر بیٹھ گئی تھی۔ مگر ڈر کے مارے
امی جانی سے بھی نہ کہہ سکی تھی۔ وہ تو کل جہانوں باجی کی الماری سے ایک
بندھے ہوئے پلندے کو میں یونہی کھول بیٹھی تھی جو صہیب کے خط تھے
جو جہانوں باجی کے نام تھے اور باجی نے وہ ۔۔۔ احتیاط سے چھپا کر رکھے
تھے۔ اُن خطوط کو پڑھ کر معلوم ہوا صہیب کے فقرے ابھی تک میری کانوں

میں گونج رہے ہیں۔ جہانو اس کی دلیل میں ثروت کی تصویر لے آیا ہوں۔ تمہاری نہیں لایا۔ کیونکہ میں سلمان کی زندگی کو دکھ نہیں پہنچانا چاہتا ـــــ ثروت کی تصویر لے آیا ـــــ سب کچھ وہی ہے جو تم میں ہے۔ صرف اس کی پلکیں کسی کے بار سے جھکی ہیں۔ وہ میں نے پنسل سے موڑ دی ہیں ـــــ ثروت کی مسکراہٹ میں ابھی کسی نے زندگی نہیں چھینی۔ مگر تمہارے لبوں کی مسکراہٹ نے میری زندگی چھین لی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ ہزار ڈھونڈھتا ہوں ان ہونٹوں کی مسکراہٹ میں اپنی تڑپتی ہوئی زندگی کو ... ـــــ مگر ـــــ وہاں پھیکی سی مسکراہٹ کے سوا اب کچھ بھی تو نہیں ملتا جہانو ں" ـــــ اور مجھے خالہ جانی کے الفاظ یاد آگئے تھے۔ کہ ثروت تو بنی بنائی جہانو ہے ـــــ کتنا عجیب ہے صہیب۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ جہانو باجی کی شادی کے بعد جب میں نے تصویر دی تھی صہیب بھیا کو اور باجی کے الفاظ دھرائے تھے تو وہ پاگلوں کی طرح سے میرے چہرے کو گھور رہا تھا۔ اور میں کتنی نروس ہو گئی تھی ـــــ اس کے بعد میں نے صہیب کو کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا ـــــ مگر اس دن وہ پہلی بار مسکرایا تھا ـــــ جب جہانو باجی علیگڈھ سے واپس آئی تھیں ـــــ اپنی سسرال سے ـــــ مگر جب جہانو باجی نے ان سے پوچھا تھا ـــــ صہیب بھیا

کیسے ہیں آپ۔ تو وہ اس شام کی طرح، ویسے ہی اداس مرجھا سے گئے تھے ——— وہ جھلملاتی ہوئی ——— آنکھیں آسمان کو نہیں گھور رہی تھیں ——— بلکہ جہانوں کی سفید سی ناک میں چمکتی ہوئی ہیرے کی کیل کو گھور رہی تھیں ——— جیسے ——— کیسے ہیں آپ۔ کا جواب' اس کیل سے کہہ رہے ہوں کہ جواب کیوں نہیں دیتی ——————

اور جہانو باجی زرد پڑگئی تھیں ——— کمر پر پڑی ہوئی بل دار سیاہ چوٹی جیسے تڑپ گئی تھی ——— سیاہ بالوں میں چمکتی ہوئی سفید باریک سی مانگ جو سفید باریک دوپٹے کا بوجھ نہ سہار سکی اور جلدی سے پھینکدیا تھا ——— گھنی گھنی سیاہ مڑی ہوئی پلکیں ایک ساتھ زمین پر جھک گئی تھیں ——— اور گورے گورے ہاتھ کانپ گئے تھے جو اس وقت بادامی سے ریشمی برقعے کے بٹن نہ کھول سکے تھے ——— اس وقت جب باجی سسرال سے آتے ہی امی جانی کے سینے سے لگی رو رہی تھیں ——— اور میں خوشی سے چیخ اٹھی تھی ——— جہانو باجی آپ کب آئیں ——— اور سلمان بھیا نہیں آئے آپ اکیلی آئی ہیں' وہ امی جانی کو چھوڑ کر میری طرف پھیکی سی مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی ——— بڑھی تھیں ——— ہاں فرصت سلمان کو کام بہت تھا کہتی مقدسے تھے اس لئے نہیں آئے میرا دل گھبرایا اور میں اکیلی ہی آگئی — کیوں؟

ثروت تم کیسی ہو؟ ـــــ اور وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھیں
ـــــ جیسے پوچھ رہی تھیں کیوں تمہارا دل گھبراتا ہے ـــــ اور وہ
سفید منّے سے رومال سے اپنی گھنی گھنی مڑی ہوئی چمکدار پلکوں میں
ٹھہرے ہوئے آنسو پوچھ رہی تھیں کہ اتنے میں صہیب بھیّا۔ململ کا
سفید کرتا پہنے کمرے میں گھس آئے تھے ـــــ اور یہ ـــــ
جہانوں باجی کے ایک ہاتھ میں برقے کا اوپر کا حصہ تھا ـــــ وہ
سر سے گر پڑا ـــــ زمین پر ـــــ ارے میں نے جھک
کر ان کو برقعہ کا اوپر کا حصّہ دیا ـــــ تو دوسرے ہاتھ سے چھوٹا سا
اٹیچی کیس چھوٹ گیا۔ اور گرتے ہی ـــــ کھل بھی گیا۔ جس میں سے
کچھ چیزیں گر پڑیں ـــــ ارے جہانو باجی ـــــ میں حیرت سے
انہیں دیکھ رہی تھی ـــــ وہ صہیب بھیا کی طرف۔ اور صہیب
کُرتے کا بٹن پکڑے ہوئے۔ گرے ہوئے اٹیچی کیس کو گھور رہے تھے
جیسے کہہ رہے تھے ـــــ یہ میرا قصور نہیں۔ میرا قصور نہیں ـــــ
امی جانی ـــــ کمرے سے جا چکی تھیں ـــــ میں آہستہ آہستہ
چیزیں اٹھا رہی تھی۔ کوئی پاؤڈر کا ڈبہ کتنا پیارا سا جس پر بطخ کی ایٹ
بنے ہوئے تھے ـــــ چھوٹا سا پرس۔ رائٹنگ پیڈ۔ لپسٹک اور نیلے
نیلے لفافے۔ جو گر کر بکھر گئے تھے ـــــ میں جلدی جلدی لفافے اٹھانے

لگی ـــــ ایک کھلے ہوئے لفافے ہیں سے سر سے دو تصویر گر پڑیں ـــــ
ارے ـــــ صہیب۔ بھیّا ـــــ کی ـــــ تصویر، اور ـــــ اور
جہانوں باجی لپک کر مجھ پر جھک گئیں ـــــ اب پھر وہ لفافے
گھبراہٹ میں مجھ سے چھین کر صہیب کو دے رہی تھیں ـــــ مگر
صہیب سیاہ مڑی ہوئی گھنی چمکدار پلکیں ـــــ اُداس سی نظروں کیطرف
مڑیں تو، خوبصورت آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے ـــــ اور ہونٹ
بھینچے ہوئے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں ـــــ بس اب نہ ستاؤ ـــــ
جہانو باجی خود بھی مرجھا سی گئی تھیں ـــــ میری طرف دیکھ کر صرف
پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر بکھیرتے ہوئے بولیں، لو میں بھی کس قدر
پاگل ہوں۔ اپنے لفافے صہیب بھیا کو دے رہی تھی ـــــــــــ
صہیب بھیّا میں جیسے اس وقت جان آگئی تھی ـــــ وہ بٹن کو
بدستور موڑتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ لئے آہستہ سے میری طرف
دیکھ کر بولے ـــــ اوہ کتنی پاگل ہے۔ جہانوں مجھے اور اپنی
چیزیں دے رہی ہے۔ اور اب . . . . جب ان کا مالک بھی موجود
ہے۔ اب تم مجھے کیا دو گی۔ کافی چیزیں تم نے دیدی ہیں ـــــ اب
مجھے کچھ نہیں چاہیئے ـــــ وہ میری طرف پھر گھورنے لگے تھے ـــــ
جیسے کہہ رہے ہوں ـــــ تم سب باتیں پوچھنا چاہتی ہو ـــــ میں

کبھی نہیں بتاؤں گا، اس ہیرے کی چمکتی ہوئی کیل سے پوچھو ــــــ وہ جہانوں باجی کو گھورنے لگتے تھے ــــــ تم کیسی ہو ــــــ غریب جہانوں باجی سے اپنے برقعہ کے بٹن بھی نہیں کھل سکے تھے ــــ گورے گورے ہاتھ کیسے کانپ رہے تھے۔ سفید پیشانی پر اس سردی میں پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ مڑی ہوئی گھنی چمکدار پلکوں پر رکے ہوئے آنسو رخساروں پر ڈھلک گئے تھے ــــ جیسے کہہ رہے تھے یہ ہے میرا حال ــــــ ان کے ہونٹ کانپنے لگے تھے ــــــ مگر وہ کچھ نہ کہہ سکیں تھیں۔ وہ خوف سے میری طرف دیکھ رہی تھیں جیسے میں یہ سب باتیں امی جانی سے کہدوں گی ــــــ مگر میرے دل میں نہ جانے ان دونوں کی کیوں اتنی محبت ہے ــــــ اس وقت اگر میرا بس چلتا تو ــــــ سلمان کا گلا گھونٹ دیتی ــــــ اور حبیب بھیا اور جہانوں کی دونوں کی شادی کر دیتی ــــــ مگر نہ جانے کیوں امی جانی نے جہانوں باجی سے نہ کر دی ــــــ دونوں کی شادی۔ ــــــ میں یہی سوچتی رہتی ہوں ــــــ جب مجھے اتنا ہوش ہی نہیں تھا ــــــ کتنی بدھو تھی میں اس زمانے میں ــــــ سوائے کھیلنے کودنے کے اور زندگی کسی میں نظر ہی نہیں آتی تھی ــــــ اب جب آنکھیں کھلیں تو کیا ہوتا ہے۔ جب میں امی جانی سے پوچھتی

کہ آپ نے مہانوں باجی کی شادی کیوں صہیب بھیا سے نہ کر دی۔ تو وہ مجھے سر سے پاؤں تک حیرت سے دیکھتیں۔ اور سر کھجاتے ہوئے ——— ناک چڑا کر کہتی ——— تجھے ان باتوں سے کیا غرض ——— چلو جا کر اپنے بابا کے کمرے کی گھنٹی بجاؤ کھانے کا وقت ہو گیا۔ مگر وہ ابھی دفتر میں ہی بیٹھے ہیں۔ اور میں جب اپنے سوال کا یہ جواب سنتی تو بس غصہ ہی آجاتا ———

اس روز کھانے کی میز پر میری پلیٹ میں آلو ڈال رہی تھیں تو انہوں نے گھورتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تھا۔ تم صہیب کے کمرے میں اتنا کیوں جاتی ہو جی ——— کیا اس نے تم سے کچھ کہا تھا ——— شادی کے بارے میں ——— وہ پھر بابا جان کی طرف دیکھنے لگی تھیں ——— جو اپنے پلیٹ پر جھکے ہوئے ——— کانٹے کی مدد سے آلو سوس میں ملا کر کھا رہے تھے ——— مگر مجھے ایسا اس وقت محسوس ہوا تھا جیسے ابلے ہوئے آلو حلق میں پھنس رہے تھے، مگر میں ہوش میں آگئی تھی ——— نہیں تو میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی، کتنا اچھا ہوتا ——— صہیب بھیا اچھے ہیں سلمان بھیا سے ——— میں لاڈ کے لہجے میں بولی ——— کانٹے سے آلو اٹھاتے ہوئے میں نے دیکھا تو امی جانی اور بابا جان مجھے گھور رہے تھے ——— جیسے

کہہ رہے ہوں کہ اچھا بیٹی! ــــــ یہ بات ہے ــــــ شاید تمہیں
بھی صہیب پسند آ گئے ــــــ ٹھہرو ہم تم سے ہی کر دیتے ہیں ان کی
شادی ــــــ اور میں شرما سی گئی ہاتھ کانپنے لگے۔ سفید ٹیبل کلاتھ پر
کانٹے سے آلو نکل کر دور جا پڑا۔ ٹماٹر کی چٹنی میں بھیگا ہوا آلو ــــــ
سفید ٹیبل کلاتھ پر گرتے ہی اپنے چاروں طرف چمپئی سا گھیرا بنانے
لگا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے سفید بلاٹنگ میں سیاہی خود بخود ہی
رستی جاتی ہے۔ اور سیاہی کا دھبہ بڑھتا ہی جاتا ہے آہستہ آہستہ
سرکتا ہوا سا ــــــ ایسے ہی آلو کے چاروں طرف چمپئی سے رنگ
کا دائرہ بڑھتا ہی جاتا تھا ــــــ کمبخت زندگی میں پہلی بار آلو
اس روز مجھے بُرا لگا تھا ــــــ

کتنی بدتہذیب ہو گئی ہو تم ثروت!

امی جانی کبھی آلو کو، اس کے بڑھتے ہوئے نارنجی سے دائرے
کو کبھی مجھے کبھی بابا جان کو گھور رہی تھیں ــــــ اور میرا جی چاہا کہ سلب
آلو اور ٹماٹر کی چٹنی جو مجھے بے حد پسند تھی ــــــ پلیٹ میں سے
نکال کر امی کے سامنے میز کے نیچے رکھی ہوئی ٹوکری میں ڈال دوں،
مگر امی جان کی نظروں کی تاب نہ لا کر میں ہل بھی نہ سکی تھی ــــــ ان
دلوں میں امی جان سے کتنا ڈرتی تھی۔ توبہ ہے ــــــ اب ــــــ

ہنسنا اب تو کبھی بھی نہ ڈروں ——— اب بڑی جو ہوگئی ہوں ———
خیر سے اب تو امی جانی بغیر مجھے ساتھ لئے شوپنگ کرنے بھی نہیں
جاتی ہیں ——— خدا کی شان ہے وہی ہم ہیں ——— بدتہذیب اور
وہی امی جانی ——— مگر جہانوں باجی ——— ایک خوشی تو مجھے
بھی ہوئی تھی ان کی شادی سے ——— کہ ——— ساری ان کی
چیزیں مجھے مل گئی تھیں ——— ان کا سجا سجایا آرٹسٹک سا کمرہ —
صہیب بھیا کے کمرے کی طرح کا بالکل ——— جیسے ایک ہی شخص
نے دو کمرے اپنی پسند سے آراستہ کئے ہوں۔ مجھے خوشی تھی —
کہ میں بھی ان دونوں کی طرح ہم ذوق ہوں ——— وہی الماری مگر
ان پر پڑے ہوئے پردوں پر گرد نہیں۔ گہرے نیلے سے کیونکہ باجی کی
طرح میں بھی روز صبح اٹھ کر اپنا کمرہ صاف کرتی ہوں۔ ایسا ہی نرم سا
بستر نیلے بیڈ کور سے چھپا ہوا مگر سلوٹیں ذرا بھی نہیں ہیں۔ ایک چھوٹی
سی کتابوں کی الماری۔ جس میں غالبؔ، ذوقؔ، اقبالؔ، جوشؔ، اصغرؔ، فانیؔ،
حافظؔ کے دیوان شیلے، شیکسپیر، گوئٹے کی زندگی موٹی موٹی جلدوں میں بند،
کرشن چندر کا شکست ناول ——— اُف کس قدر رنگین اور رسیلے
ہوئے جذبات ہیں۔ پڑھتے پڑھتے میں بے اختیار رو پڑی تھی ———
اور گھبرا کر میں نے اپنے کمرے میں چونک کر دیکھا تھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا

یہ کیوں رو رہی ہے۔ مگر ہوا سے نیلے پردے مچل رہے تھے۔ کمرے میں کوئی بھی نہ تھا ——— میں اکیلی ہی تھی ——— میں کتنا روئی تھی، ہچکیاں بندھ گئی تھیں ——— سنبٹل ہیں پر میری نگاہیں خود بخود ہی پہنچ گئی تھیں ——— جہانوں باجی کی اداس پھیکی سی مسکراہٹ نے میرے رُکے ہوئے آنسوؤں کو بہا دیا تھا ——— آہ ان کی وہ گھنی گھنی بڑھی ہوئی پلکیں ——— جن کے سایوں میں مہیب کی زندگی کروٹیں بدل رہی تھی ——— مگر پلکوں کے بوجھ سے اٹھ نہ سکتی تھی ——— میری ناشاد باجی ——— کتنا ضبط تھا ان میں ——— میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا ——— میں ان کی مسکراتی ہوئی تصویر کو کھینچ لائی تھی اپنے دل کے قریب ——— نہ جانے کب تک روتی رہی تھی ——— مگر اُف اس روز کیسا محسوس ہوا تھا۔ جیسے جہانو باجی میرے سینے سے چمٹی ہوئی خود بھی سسکیاں بھر رہی تھیں ——— میرے جسم پر ایک بوجھ سا ہو گیا تھا۔ ان کے جسم کی بھینی بھینی خوشبو۔ میری ناک میں تیزی سے گھس رہی تھی ——— میرے گرم گرم آنسو ٹھنڈے پڑ گئے تھے اور جیسے ان کے گرم گرم جلتے ہوئے آنسو میری پلکوں سے ٹکرا گئے تھے۔ میں کتنا ڈری تھی اس دوپہر کو ——— میں یہ نہ محسوس کر سکی تھی کہ میں جاگ رہی تھی یا سو رہی تھی ——— صرف اتنا سن سکی جیسے ——— جہانوں باجی کے ہونٹ

ہل رہے تھے ـــــ کہہ رہی تھیں..... ثروت پیاری ـــــ یہ میرا آخری کام کر دینا ــــــ میری روح تمہارا احسان اُس دنیا میں بھی نہ بھولے گی ـــــ کھڑکی سے ٹھنڈے ٹھنڈے ہوا کے جھونکے میرے رخسار کو چوم رہے تھے جسکی ٹھنڈک سے میرا دل اور بھی ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔ ایسے ہی اس روز میں نے غالب کا دیوان ذرا پڑھنے کی غرض سے کھولا کہ ـــــ کیا اتنے مشکل شعر ہیں غالب کے جو باجی صہیب بھتیا سے سمجھنے کے لئے ہر روز ان کے کمرے میں جاتی تھی۔ اور ان سے شعروں کا مطلب پوچھتی تھی ہزاروں اشعار پر ٹِک لگے ہوئے تھے۔ کسی شعر پر 'ایس' اور کسی پر 'جے' بنے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں پانی کے قطروں کے نشان بھی تھے۔ پیلے پیلے دائرے سے۔ شاید آنسو ہوں ـــــ اس شعر پر میں چونک پڑی ـــــ کتنے ہی قطرے گرے تھے اس شعر پر جیسے زرد رنگ ہو گیا تھا۔ اتنی جگہ کا ـــــ یہی غالب کا مشہور شعر ـــــ

"ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے"

وہاں 'ایس' لکھا ہوا تھا ـــــ اس کے نیچے ایک اور بحر شروع ہو گئی تھی۔ وہاں ایک شعر کے بالکل قریب ہی 'جے' لکھا ہوا تھا وہی مشہور شعر ـــــ

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن ،
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

مگر جیسے کسی نے 'بچے' کاٹ کر 'ایس' بنا دیا تھا۔ زبردستی کسی کے ہاتھ سے پنسل لے کر۔ جہانوں باجی کی مینٹل پیس کے بیچ میں —— جہاں ان کی کئی سہیلیوں کی تصویریں بھی رکھی ہیں۔ ایک تصویر بیچ میں بڑی سی رکھی ہوئی ہے۔ جہانوں باجی نے بڑی محنت سے بنائی تھی۔ خود۔ اور مجھے شادی کے دوسرے دن جاتے ہوئے کہا تھا ——

ثروت جان —— ایک کام میرا کر دینا —— یہ تصویر میں نے بڑی محنت سے بنائی ہے۔ صہیب بھیا نے مجھے پڑھایا ہے اور تصویریں بنانی بھی سکھائی ہیں۔ ان کو یہ تحفہ دینا چاہتی تھی —— مگر وہ تو تین روز سے نظر ہی نہیں آئے اب میرے پاس وقت بھی نہیں۔ تم دیدینا۔ اور میں نے خوش ہوتے ہوئے لے لیا تھا —— ہاں ہاں باجی میں ضرور دیدوں گی —— وہ ٹھری ہوئی سیاہ چمکیلی پلکوں سے تصویر کو گھورنے لگیں۔ مجھے ایسی خوشی ہو رہی تھی جیسے میں باجی کی مصیبت میں کام آرہی ہوں۔ وہ رُک رُک کر کہہ رہی تھیں ——

کہنا صہیب سے —— تم بہت جلد چلے گئے —— مجھ سے ملے بھی نہیں —— اتی جانی سے معلوم ہوا کہ وہ مصر جارہے ہیں

آرٹ کالج میں مسکرانے لگیں پھیکی سی مسکراہٹ جیسے انکی مسکراہٹ کے پیچھے ہزاروں رنج وغم کلبلا رہے ہیں۔ ان کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ وہی سرخ دوپٹہ ان کے کاندھے پر سے ڈھلک گیا تھا۔ سفید لمبی سی گردن میں نیلی نیلی رگیں ہلکے ہلکے تڑپ رہی تھیں جیسے بہت کچھ وہ ضبط کرتے کرتے تھک سی رہی ہوں، سنہرے زیوروں میں سے جھانکتا ہوا سرخ وسفید چہرہ سیاہ پیچدار لٹوں میں گھری ہوئی چمکدار پیشانی ——— اور ہائے وہ بڑی ہوئی سیاہ نوکیلی پلکیں نیندیں ڈوبی ہوئی لبریز چمکدار جھرنوں پر سائے کئے ہوئے سی تھیں ——— کانپ سی رہی تھیں۔ ہوا کے خوف سے نہیں۔ اس خوف سے کہ سرمئی لکیر کہیں چمکیلے پانی کی موجوں سے مٹ نہ جائے اور آنسو چھلک نہ پڑیں ——— وہ ان کے کمرے کی طرف گھور رہی تھیں۔ نہ جانے کس وقت آتے ہیں . . . . میں نے تو پرسوں سے نہیں دیکھا ——— وہ بت کی طرح سے بیٹھی تھیں، جیسے ان کی روح کب کی میرے کمرے سے نکل کر صہیب بھیا کے کمرے میں پہنچ گئی ہو ——— ان کا چہرہ سفید سا ہوگیا تھا ——— مڑی ہوئی پلکیں بکھر سی گئی تھیں، اور جھرنے جیسے سوکھ سے گئے تھے۔ ان کا چمکیلا پانی۔ سیاہ دائرے میں تڑپنے لگا تھا۔ پھٹی پھٹی نظروں سے وہ مسلسل گھورے جا رہی تھیں صہیب کے کمرے کو۔ مگر وہاں چق پڑی ہوئی تھی۔ باریک

باریک تیلیوں والی۔ سرخ سبز سے رنگوں سے رنگی ہوئی ——— اور کچھ بھی نہ تھا ——— وہ ایک دم ہوش میں آگئی تھیں ثروت ——— وہ ایک بار ضرور آئیں گے ——— تم ان سے کہنا میں آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد آؤں گی۔ وہ جب تک یہاں ہی ٹھہریں۔ اس کے بعد وہ جا سکتے ہیں ——— کہنا۔ یہ میرا۔ آخری حکم ہے ——— آخری ——— انہوں نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے تھے ——— سرخ دوپٹے کے پلو میں لگی ہوئی سنہری لمبی لمبی نازک سی کرن۔ وہ کب سے مروڑ مروڑ کر نوچ رہی تھیں ——— جیسے اس کے نوچنے سے لوگوں کو محسوس ہو جائے کہ وہ شادی کا جوڑا پہننا پسند نہیں کرتیں۔ مگر سمجھنے والوں کو اتنا وقت کہاں کہ وہ میز پر پڑے پڑے سنہرے باریک سے تاروں کو غور سے دیکھ کر محسوس کر سکیں کہ یہ کیوں نوچے گئے ہیں ——— وہاں تو سب یہ دیکھتے ہیں کہ۔ داڑھی والے مولویوں نے لڑکی سے ہاں بھی کرا لی یا نہیں۔ اور شادی کے بعد۔ لڑکی پہنے اوڑھے رہے تو سمجھو کہ خوش ہے ——— چہرے کی تازگی اور پژمردگی کو کون دیکھتا ہے۔ ——— برقعہ پہنتے ہوئے انہوں نے مجھے بھی سینے سے لگا لیا تھا ——— اس روز وہ خوب جی بھر کے روئی تھیں ——— خوشبوؤں میں بسا ہوا جسم ——— کتنا تیز اُن کا دل دھڑک رہا تھا ——— کہ برقعہ کے بٹن بھی ہل رہے تھے ———

موٹر میں سوار ہوتے ہوئے انہوں نے میری پیشانی چوم لی تھی' اور آہستہ سے کہا تھا ——— ثروت میرے کمرے میں تم ہی رہنا۔ مگر کتابوں کو نہ کھولنا۔ کسی چیز کو نہ چھیڑنا ——— میرے پہننے اوڑھنے کی چیزیں جو تمہیں پسند ہوں تم بخوشی استعمال کرنا ——— اور ہاں صہیب جو چاہیں' وہ لے سکتے ہیں۔ ان کو میرے کمرے میں آنے دینا ——— اور نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی جو سلمان بھیا کے آتے ہی وہ ہچکچا کر رہ گئی ——— اور نقاب ڈال کر موٹر میں بیٹھ گئی تھیں ———

مجھے یاد ہیں اب بھی وہ دن۔ شادی سے پہلے کے اور شادی کے بعد بھی ——— جب وہ علیگڈھ یعنی اپنی سسرال سے واپس آئی تھیں۔ ٹھیک پندرہ دن بعد ——— اور اس رات صہیب بھیا بھی مصر چلے گئے تھے۔ نہ جانے کب سے یہ پروگرام بنا رکھا ہوگا۔ پانچ سال کا کورس تھا۔ آج پورے پانچ سال اور پندرہ دن ہو چکے ہیں۔ کل وہ آئیں گے ——— اور آج جہانوں باجی کو اس دنیا سے گئے ہوئے پورے پندرہ دن ہوتے ہیں ——— خط ملتے ہی میں نے آج پورے پانچ سال پندرہ دن بعد یہ کمرہ کھولا ہے ——— صہیب بھیا آرہے ہیں' آرٹسٹ بنکر ——— ان کا کمرہ صاف کرنا ہے ——— آج جہانوں باجی ہوتیں تو کتنی خوش ہوتیں ——— صہیب آرہے ہیں ———

وہ صہیب جن کو دیکھنے کے لئے۔ صرف ایک بار دیکھنے کے لئے باجی نے
تین سال کے بجائے گھسٹ گھسٹ کر اسی انتظار میں اپنی جان دیدی
دو سال انتظار میں جیتی رہیں کہ پانچ سال بعد صہیب آئیں گے ——
مگر افسوس پندرہ دن پہلے ختم ہو گئیں —— ڈاکٹروں نے تو دو سال
پہلے ہی جواب دیدیا تھا۔ مگر انتظار کے دو سال گھسیٹے —— میرے
کمرے میں مرنے سے پہلے۔ کچھ روز پہلے جب سب کہتے تھے کہ دق
کا مریض سنبھالا لیتا ہے۔ مگر باجی نے اس سنبھالے میں بھی ایک آخری
تحفہ صہیب کے لئے تیار کیا —— کتنی محنت کی تھی اس تصویر پر۔
امی جان —— روتے روتے کہتی تھیں، کہ جہانوں اب تمہاری
طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔ تم آرام کرو۔ اور وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے
سے انہیں دیکھنے لگتیں —— جس کی تاب نہ لاکر امی جان آنسو پونچھتے
ہوئے منہ پھیر لیتیں —— جیسے وہ سمجھ جاتیں —— اور باجی آنکھوں
ہی آنکھوں میں کہہ جاتیں۔ امی تم نے آرام کرنے کے لئے مجھے راستہ
بتا دیا۔ اب کیوں فکر کرتی ہو —— میں آرام سے سو جاؤں گی ——
مگر وہ سوچتے سوچتے گھبرا کر کھانستے ہوئے کہہ جاتیں۔ نہیں امی میں
تصویر بنا رہی ہوں۔ دل گھبرانے لگا ہے اب تو لیٹے لیٹے —— میں
کانپ جاتی تھی ان کے اس لفظ پر۔ دل گھبرانے لگا ہے۔ اسی دل نے

تو گھبرا کر اس دنیا کے جانے کا راستہ سمجھا دیا ہے ــــــ اُف! پیاری سی باجی ــــــ انہوں نے مرنے سے ایک دن پہلے تصویر پینٹ کر لی تھی ایسی ہی اداس سی شام کو ..... جب میں نہا کر ان کے کمرے میں گئی تھی ــــــ تو وہ اس اندھیرے کمرے میں تصویر کو سینے پر رکھے کھڑکی سے اُداس سی شام میں کھوئی ہوئی سی تھیں۔ زرد زرد سے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے ــــــ کتنی دبلی ہوگئی تھیں ــــــ شام کے دھندلکے میں سفید بستر پر ایک ڈھانچا سا پڑا ہوا تھا ــــــ مڑی ہوئی پلکیں نہ جانے کیوں ہر وقت بھیگی بھیگی رہتی تھیں۔ اف کس قدر چمکدار ہوگئی تھیں ان کی آنکھیں ــــــ میں زور سے کھانسی تو وہ چونک پڑیں ــــــ پھیکی سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے۔ آہستہ سے بولیں۔ ثروت! ــــــ وہ کیسی اداس نظروں سے مجھے گھور رہی تھیں ــــــ میرا دل اندر سے تڑپ گیا ــــــ میرا جی چاہا کہ چیخیں مار مار کر رونے لگوں اور شاید باجی بھی سمجھ گئی تھیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنے بازو پھیلا دیئے تھے اور میں نے ان کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا تھا ــــــ ان کے گول گول نرم ہاتھ اب کتنے سخت ہوگئے تھے۔ لمبے لمبے ــــــ وہ کس محبت سے میرے گرم گرم رخسار پر پھیر رہی رہی تھیں ــــــ میں ڈر ڈر کے رو رہی تھی ــــــ کہ باجی کو محسوس

نہ ہو ـــــ مگر شاید مرنے والے کو ساری چیزوں کا علم ہو جاتا ـــــ
انہوں نے میرے ہلکے سے چپت لگاتے ہوئے کھانسی کو روکتے ہوئے
کہا تھا ـــــ ثروت جان ـــــ تم روتی کیوں ہو ـــــ خوش
ہونا چاہیئے کہ تمہاری باجی اب جلدی آزاد ہونے والی ہے۔ اس ذہنی
بوجھ سے جس سے وہ دبی جا رہی تھیں ـــــ پیاری بچی ۰۰۰ خدا
نہ کرے کہ تم اپنی ہونٹوں کی مسکراہٹ کسی کو دو ـــــ پھر تم عمر
بھر صرف ایک بار ہنسنے کے لئے نہیں مسکرانے تک کو ترس جاؤ گی۔
خدا نہ کرے ـــــ میں اس وقت میری جان ـــــ میری
طبیعت زیادہ خراب ہے ـــــ میرا وقت قریب ہے۔ مجھے معاف
کرنا۔ شاید میں نے تمہیں کبھی ڈانٹ دیا ہو۔ اس وقت تم میری چھوٹی
بہن نہیں ـــــ

ـــــ بلکہ ایک ہمدرد دوست ہو ـــــ میری ثروت اس
کھڑکی کو بند کردو ـــــ دیکھو تو آج کی شام کتنی سوگوار ہے ـــــ
غم سے نڈھال ـــــ کھڑکی بند کردو ـــــ وہ پاگلوں کی طرح
کھڑکی سے باہر گھور رہی تھیں ـــــ کتنا تیز سانس چل رہا تھا۔
ـــــ دل کی دھڑکن کتنی تیز تھی ـــــ کھلے ہوئے بالوں کی

سیاہ لٹیں سینے پر پڑی ہوئی دل کی ہر حرکت سے تڑپ جاتی تھیں
..... میں نے کھڑکی بند کر دی تو کتنا خوفناک قسم کا اندھیرا ہو گیا تھا
سفید بستر پر پڑی ہوئی باجی سچ مچ کا مردہ معلوم ہو رہی تھیں مگر اس اندھیرے
میں ان کی آنکھیں کیسی چمک رہی تھیں ـــــ میں نے اپنے ڈر کو چھپاتے
ہوئے کہا تھا باجی ـــــ آپ کہیں تو بجلی جلادوں بہت اندھیرا ہو رہا
ہے۔ رات ہو گئی اب تو ـــــ وہ کھانستے ہوئے بولیں۔ بس تھوڑی
سی دیر اور ہے میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ پھر امی بھی نماز
پڑھ کر آجائیں گی اور غریب سلمان بھی ڈاکٹر کو لے کر آتے ہوں گے۔
ایسا ہی ہے تو شمع روشن کر دو ـــــ وہ شام میں کبھی نہ بھولوں گی
ـــــ سفید نرم تکیئے میں دھنسا ہوا باجی کا سر۔ شمع کی زرد تھرتھراتی
ہوئی ہلکی سی روشنی میں باجی کا زرد چہرہ، وہ چمکتی ہوئی آنکھیں۔ جیسے
کٹے ہوئے موتی۔ لبریز پیالے۔ ڈگر ڈگر کرتی ہوئی آنکھیں وہ مڑی ہوئی
آنسوؤں سے بھیگی ہوئی پلکیں۔ انہوں نے سینے سے تصویر اٹھا کر دکھاتے
ہوئے کہا۔ ثروت یہ تصویر پوری ہو گئی ـــــ کل رات کو میں نے پینٹ
کر لی۔ مجھے کتنا تعجب ہوا تھا۔ ارے باجی آپ رات کو بھی جاگتی ہیں۔
ہاں! وہ کچھ سوچ کر بولیں۔ پھر آہستہ آہستہ کھانستے ہوئے شمع کو
گھورنے لگیں۔ ثروت یہی شمع تو میں رات کو جلایا کرتی تھی۔ جلتے جلتے

اسمیں کتنا گہرا گرڑ ہا ہو گیا۔ پگھل پگھل کر ـــــ نہ جانے اس شمع کے بارے میں وہ کیا سوچتی سوچتی گھبرا گئیں تھیں اور کتنا گرم سانس تھا ان کا۔ جس سے شمع بھی کانپ گئی تھی۔ مگر پھر ٹک کر پھر کانپتے ہوئے جلنے لگی تھی ـــــ ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ تصویر ہاتھ میں کانپ رہی تھی۔ کتنی گہری گہری نظروں سے وہ تصویر کو دیکھ رہی تھیں ـــــ ذرا مجھے قلم اٹھا دو۔ وہ چونک پڑی تھیں جیسے کوئی بات یاد آ گئی تھی ـــــ وہ پھر شمع کو گھورنے لگی تھیں ـــــ

میں سلمان بھیا کی میز پر سے قلم لے کر واپس کمرے میں آئی تو باجی اپنا منہ تکیہ پر رکھے۔ اوندھی لیٹی تھیں لمبی لمبی زرد باہیں تکیہ کے گرد پھیلی ہوئی تھیں۔ لمبے لمبے سیاہ بال ان کی کمر پر بکھرے ہوئے تھے ـــــ اور زرد سی شمع سسکیاں بھر رہی تھی ـــــ کمرے میں کتنی اداسی تھی ـــــ میرے قدم کانپنے لگے تھے ـــــ صہیب بھیا کے کمرے کی یہ تصویر مجھے یاد آ گئی تھی ـــــ

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

آگے میں نہ سوچ سکی مگر میرے کانوں میں جیسے کوئی زور زور سے کہہ رہا تھا، سو وہ بھی خموش ہے ـــــ مگر میں ہر بار جھنجلا کر کہتی تھی ـــــ

نہیں ـــــ خدا نہ کرے ـــــــــ آنے والے وقت کے
خیال سے دل بیچین ہوگیا تھا ـــــ آنسو نکل پڑے تھے ـــــ
باجی میں نے ان کے سوکھے ہوئے ہاتھ کو ہلایا ـــــ اُف
کس قدر دھک رہی تھیں ـــــ لے آئیں۔ وہ سیدھی لیٹ گئیں
اپنی سفید ساڑھی سے بھیگا ہوا منہ پوچھتی ہوئی ـــــ کتنی سُرخ
ہوگئی تھیں ان کی آنکھیں جیسے شعلے دھک رہے تھے۔ چمکیلے
سفید پردے کے پیچھے ـــــ کانپتے ہاتھوں سے انہوں نے پین
میرے ہاتھ سے لے لیا۔ سلمان۔ وہ پین کو غور سے دیکھ رہی تھیں
یہ سلمان کا پین ہے۔ ان کے پن سے میں آخری دفعہ لکھ رہی ہوں ـــ
صہیب کے تحفہ پر ـــــ کتنا ظلم ہے غریب سلمان پر۔ بیچارے ـــ
میں انہیں خوش نہ رکھ سکی ـــــ یہ میرا قصور ہے ـــــ کتنا بیچین
ہے ـــــ ثروت ـــــ وہ گھبرا کر چونک پڑیں۔ کیا تم سلمان
کو پسند کرتی ہو ـــــ ان کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ جلدی بتاؤ۔ وہ زور
سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولیں ـــــ میں ـــــ کیوں ـــ
نہیں تو ـــــ مجھے ویسی ہی جلن ہونے لگی تھی کہ جیسے صہیب اور
باجی کی شادی نہ ہونے کے ذمہ دار سلمان ہی ہیں۔ مجھے نفرت
سی تھی سلمان سے ـــــ مگر باجی نے ایسا ٹیڑھا سوال کیوں

کیا تھا ـــــ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں ـــــ مگر جب میں نے نہیں کہا تھا۔ تو وہ زرد پڑ گئی تھیں اداس چہرہ ہو گیا تھا ـــــ ان کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا تھا ـــــ اور صہیب ـــــ وہ اور بھی آہستہ سے بولیں ـــــ ہاں وہ اچھے ہیں ـــــ میں نے بغیر جھجک کے کہدیا تھا ـــــ اس لئے کہ وہ باجی کو پسند تھے؛ اور میں بھی اسی لئے پسند کرتی تھی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ انہوں نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ کتنی لمبی آہ کے بعد وہ صرف اُف پروردگار ہی کہہ سکی تھیں۔ کیوں باجی آپ کیوں پوچھ رہی ہیں میں نے ان کی بڑھتی ہوئی گھبراہٹ سے ڈر کر کہا تھا ـــــ وہ شمع کو گھورتے ہوئے بڑبڑائی تھیں ـــــ اف ثروت تم نے یہ کیا کہدیا ـــــ میں چاہتی تھی کہ ـــــ خفا تو نہ ہو گی۔ وہ مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھیں ـــــ باجی میں نے بے قرار ہوتے ہوئے کہا تھا۔ میں آپ کی ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کروں گی ـــــ وہ زور سے ہنس پڑی تھیں۔ کھوکھلی ہنسی۔ جس کے ساتھ ہی کھانسی بھی شروع ہو گئی تھی۔ کچھ دیر کھانسنے کے بعد وہ میرا ہاتھ پکڑ کر منت سے کہہ رہی تھیں۔ ثروت۔ میں بڑی بدنصیب ہوں۔ میں کسی کی بھی خدمت نہ کر سکی۔ آج میں تم سے سب کچھ کہدوں گی ثروت...

میں نے صہیب کو رنج پہنچایا ـــــ میں نے اس کے دل کو دکھایا۔
پر یہ تو میرا تصور نہ تھا۔ اس کی ذمہ دار امی جانی ـــــ بابا جان ـــ
خالہ جان ـــــ خیر اب مجھ کو چاہئے تھا کہ سلمان کی خدمت
کرتی اس کی روح کو اپنی روح نذر کرتی ـــ مگر ثروت ـــــ وہ
رو پڑی تھیں، ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ ثروت میں صرف ان کو جسم
پیش کر سکی ـــــ ثروت میری روح ان کی شکل دیکھ کر کانپ
جاتی ـــــ بھٹکتی پھرتی ـــ رہی۔ اپنے پرانے گھر میں۔ وہ کسی کی
پریشان روح میں سما جانا چاہتی تھی ـــــ مگر ـــــ رنگین بندھنوں
سے کیسے نکل سکتی تھی ـــــ میں نے سلمان کو ابتک فریب دیا۔
مگر وہ بچہ نہیں ـــــ اس کے لئے میں عذاب تھی ـــــ وہ اپنے ـــ
راہ گذر پر چلتے چلتے مجھے گھسیٹ کر لا کھڑا کرتا ـــــ میں بھی مسکراتے
ہوئے اُسے یقین دلاتی کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ وہ خوشی سے
دیوانہ ہو جاتا تھا ـــــ اور جوش میں اپنے گرم گرم ہاتھوں سے میرا ہاتھ
پکڑتا کہ چلو میں بھی مجبوراً بڑھتی ـــــ مگر ـــــ جب وہ گرم ہاتھ
میرے ان سرد گوشت ہڈیوں کے ڈھانچے کو پکڑتے چلنے کے لئے۔
زندگی کی راہ پر تو ـــــ وہ کانپ جاتا۔ مگر میری روح کب کی اُڑتی
ہوئی اس پریشان روح کو ڈھونڈنے ـــــ ان پریشان نظروں میں

کھو جاتی تھی ـــــ جو مصر میں آرٹ سیکھ رہی ہیں ــ ثروت میں
نے سلمان کو دھوکا دیا ــــ مجھے اس کا احساس ــ کیا ــ
کیا تم اپنی بہن کا بدلا اُتار سکتی ہو ــــ ثروت ــــ ان کو خوش
رکھ سکتی ہو ــــ اگر تم ہاں کر دو ــــ تو ــــ میں ابھی خوشی سے
پاگل ہو جاؤں گی ــــ اور میری روح ذہنی بوجھ سے ہلکی ہو جائے
گی ــــ پھر میں شاید اطمینان سے مر سکوں ــــ اور میرے
منہ سے بے اختیار ــــ ان کی تکلیف سے بے قرار ہو کر ــــ
نہ جانے کیسے اتنی جلدی ہاں نکل گیا ــــ ایک سیکنڈ میں۔ اپنی
زندگی کو گروی ڈال دیا تھا ــــ کتنا غضب ہو گیا تھا ــــ اس
رات سے اور آج تک میری روح جیسے کسی نے بھینچ ڈالی ہے ــ
جب کبھی خیال آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہلکے ہلکے کوئی
میری تازگی کو نچوڑ ڈالتا ہے ــــ وہ ایک قسم کی خوشی اب کچھ
بجھ سی گئی ہے ــــ باجی نے کتنا ظلم کیا مجھ پر ــــ کیا پتہ میں
بھی کسی کو خوش رکھ سکوں ــــ یا ــــ جب یہ سوچتی ہوں تو
باجی کی شکل سامنے پھرنے لگتی ہے ــــ میرے ہاں کرنے پر وہ
بے اختیار اٹھ بیٹھی تھیں۔ اور مجھے اپنی ساری قوت سے بھینچ ڈالا تھا۔
مگر پھر ثروت کہہ کر مجھے گلے لگا کر رونے لگی تھیں ــــ آنسو تھمتے ہی

نہ تھے ـــــ پھر تصویر کی طرف دیکھ کر کہا تھا ـــــ ثروت میری پیاری
بچی۔ میں تمہارا احسان اس دنیا میں بھی نہ بھولوں گی ـــــ یہ تصویر صہیب
کو دینا ـــــ اور کہنا ـــــ کہ موت کا دروازہ تو میں نے ـــــ دو سال پہلے
ہی دیکھ لیا تھا ـــــ تم جاتے ہوئے راہ بتا گئے تھے ـــــ میں اسی راہ
چلی گئی ـــــ کہنا کہ ـــــ وہ پھر کھانسنے لگی تھیں ـــــ کہنا ثروت۔ میں
نے اپنا راستہ نہیں بدلا ـــــ میں چلتی ہی گئی ـــــ اس راہ کو میں نے
بہت جلد چھوڑ دیا ـــــ جہاں سلمان کھڑے چلا رہے تھے ـــــ وہ مجھے
پکڑنا چاہ رہے تھے ـــــ مگر میری روح کی بلندی تک وہ نہ پہنچ سکے ـــــ
بس تمہاری بتائی ہوئی راہ پر چلتی گئی۔ امی نے آوازیں دیں۔ کہا وہ دودھ نہ
بخشوں گی۔ بابا جان نے سمجھایا ـــــ مگر صہیب میں نے اپنی راہ نہ چھوڑی
موت کے قدموں کے نشان پہ اپنے قدم رکھتی ہوئی آخر اس کے دروازے
تک پہنچ ہی گئی تھی ـــــ دو سال پہلے ـــــ مگر صہیب تم پورے پانچ
سال بعد آنے کا وعدہ کر گئے تھے۔ بڑی مشکل سے اتنے دن انتظار کر سکی
ـــــ ابھی کچھ دن باقی ہیں صہیب اب موت کا دروازہ کھلنے والا
ہے ـــــ اب میں انتظار نہیں کر سکتی ـــــ مگر میری روح ضرور
انتظار کرے گی ـــــ کاش میں ـــــ تم کو ایک بار ـــــ صرف ایکبار
مرنے سے پہلے دیکھ سکتی ـــــ میری روح شدت سے تمہارا انتظار

کرے گی ـــــ اس کی گواہی میری بنائی ہوئی یہ تصویر ہے ـــ تم ـــــ آزمالینا ـــــ ان کو بخار بے حد تیز ہو گیا تھا ـــــ روتے روتے آنکھیں سوجھ گئی تھیں ـــــ پانی ـــــ انہوں نے آہستہ سے پانی مانگا تھا' ان کا سانس بگڑ گیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اور جب میں پانی لے کر امی جان کو آواز دیتی ہوئی ان کے کمرے میں بھاگتی ہوئی گئی تھی ـــــ تو ـــــ میری پیاری باجی آزاد ہو چکی تھیں ـــــ وہ ہم سب کو روتا چھوڑ کر ـــــ موت کا دروازہ کھلتے ہی اندر گھس گئی تھیں' باجی ـــــ میری جہانوں ـــــ باجی ـــــ مگر کتنا ظلم کیا مجھ پر ـــ خود آزاد ہو گئیں ـــــ اور ـــــ مجھے گروی کر دیا ـــــ زندگی اتنی مشکل نہیں ـــــ جتنا کسی کا دل بہلانا ـــــ آج بھی ایسی ہی اداس شام ہے۔ کاش میری روح بھی میرے اس بوجھل جسم سے نکل سکے ـــــ صہیبؔ کے آنے سے پہلے ـــــ میں کیسے بتاؤں گی ـــــ کیسے ان کی بنائی ہوئی یہ تصویر دوں گی۔ جب وہ سفر سے تھکے ہوئے اسی پلنگ پر بیٹھیں گے اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے نیچی نظریں کئے ہوئے مجھ سے پوچھیں گے کہ ـــ ثروت ـــــ جہانوں کہاں ہے ـــــ تو ـــــ اس وقت میں کس منہ سے کہوں گی ـــــ ہاں ـــــ یہ تصویر ان کے سوال کا جواب دے گی ـــــ یہ گہری سیاہ شام ـــــ یہ گہری سیاہی میں ڈوبا

ہوا آسمان دور اُفق میں جہاں ہلکے سے سرخ۔ زرد اور سیاہ رنگ کی چادر اوڑھے سورج کب کا بے خبر سو گیا تھا ـــــ چند پتھروں کے ڈھیر کے پاس ایک سیاہ سے گڑھے میں پڑی ہوئی انسانی کھوپڑی جسکے صرف آنکھوں کے دو گڑھے۔ ناک کے دو ننھے ننھے چھید اور دہلانے کا ہیبت ناک گڑھا ـــــ آنکھوں کے نشان میں سے دو خشک ٹہنیاں جو سیاہی میں کھو گئیں تھیں ان کے سروں پر زرد چمپا کے پھول کھلے ہوئے تھے ـــــ اس تصویر کے نیچے باجی نے ـــــ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھا تھا ـــــ انتظار ـــــ اور وہی غالب کا شعر ؎

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

میری روح جیسے کسی نے جھنجوڑ ڈالی۔ سردی سے سارا جسم کانپنے لگا۔ کمرے میں اندھیرا گھپ ہو گیا تھا ـــــ باہر بڑی سخت بارش ہو رہی تھی ـــــ صہیب بھیا کے اس اندھیرے کمرے میں مجھے ڈر لگنے لگا۔ ـــــ میرے آنسو بے اختیار نکل پڑے ہیں۔ میں یہی سوچ رہی ہوں کہ کیسے صہیب کو بتاؤں گی ـــــ اور یہ کہ میں گردی ہو چکی ہوں ـــــ یہ سب کیوں ہوا ـــــ مجھے باجی پر غصہ آنے لگا ہے۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے باجی میرے سینے سے لپٹی ہوئی سسکیاں بھر رہی ہیں۔

میری ضرورت — میرا آخری کام کر دینا — کل صہیب آئیں گے —
میں — میری روح تمہارا احسان اس دنیا میں بھی نہ بھولے گی —
میں گھبرا کر کمرہ چھوڑ کر بھاگ آنا چاہتی ہوں — مگر مجھے ایسا محسوس ہو رہا
ہے۔ جیسے باجی میرے پیچھے بھاگتی ہوئی آ رہی ہیں۔ جیسے اس کمرے میں
باجی کی روح — آہستہ آہستہ پھر رہی ہے — پردوں سے گلے
ملتی ہوئی۔ اس کمرے میں رہنے والے کے جذبۂ محبت سے — وہ
مجھے جھنجھوڑ رہی ہیں۔ کل صہیب آ رہے ہیں۔ میری تصویر ضرور دینا۔ میری
روح تمہارا احسان کبھی نہ بھولے گی۔ یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے انکے
جسم کی خوشبو سے میرا دماغ پھٹا جاتا ہے اور باجی مجھے بھینچے ڈال رہی ہیں۔ میرا
دم گھٹنے لگا — میرے ہاتھ سے جھاڑن اور تصویر زمین پر گر پڑی —
ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور کھلے ہوئے سڑک کے دروازے بھی ایک دھماکے
کے ساتھ بند ہو گئے — اور میں نے دیکھا کہ اندھیرے میں باجی تصویر
کو سینے سے لگائے کھڑی ہیں۔ مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔